مُنتَخَبَات

(مجموعہ مقالات)

ڈاکٹر مظہر معین

کلیہ علوم شرقیہ
جامعہ، پنجاب، لاہور، پاکستان

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب : مُنتَخَبَات

نام مصنف : ڈاکٹر مظہر معین

صفحات : 208

تعداد : 500

قیمت : -/150 روپے

کمپوزنگ : محمد عقیل عمر

سرِورق : علی احمد، محمد نوید ریاض

طبع اوّل : جُمَادَی الثانیہ 1431ھ / جون 2010ء

طابع : محمد خالد خان
ڈائریکٹر شعبہ طباعت و اشاعت،
پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور، پاکستان

ناشر : کلیہ علوم شرقیہ، جامعہ پنجاب، لاہور

Faculty of Oriental Learning,
University of the Punjab,
Lahore, Pakistan.

ISBN: 978-969-9325-05-2

اِنتِسَاب

سیّد عبداللطیف قادریؒ،

سید صدر الدین خوارزمیؒ،

و دیگر تمام اجداد و اقارب، بالخصوص

والدین مَرحُومَین کے نام

رَبِّ ارحَمهُمَا کَمَا رَبَّیَا نِی صَغِیرًا

اظہارِ تشکر

میں ان تمام اہل علم وادب کا انتہائی شکرگزار ہوں، جنہوں نے اس کتاب کے مسودہ کو پڑھا، متن وتراجم کی تصحیح وتحسین میں رہنمائی فرمائی اور اس کتاب کی تصنیف وطباعت میں معاون ہوئے۔ بالخصوص رئیس الجامعہ ڈاکٹر سید مجاہد کامران، ڈاکٹر سید خورشید الحسن رضوی، جسٹس (ر) نذیر احمد غازی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر سید محمد اکرم، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، ڈاکٹر محمد سلیم مظہر، ڈاکٹر حافظ محمود اختر، ڈاکٹر سیدہ نادرہ زیدی، ڈاکٹر سید قلب عابد، ڈاکٹر سید محمد قمر علی زیدی، ڈاکٹر سید جواد ہمدانی، ڈاکٹر حامد اشرف ہمدانی، ڈاکٹر حافظ عبد القدیر، ڈاکٹر محمد ناصر نیز محمد خالد خان اور جملہ ملازمین مطبع جامعہ پنجاب کا انتہائی ممنون ومتشکر ہوں۔ فجزا هم الله أحسن الجزاء.

(مصنف)

فہرست

☆ تقدیم: پروفیسر ڈاکٹر سید خورشید رضوی	7
☆ تعارفِ کتاب: جسٹس (ر) نذیر احمد غازی	10
☆ عرضِ مؤلف	13
1- شاعری کا اسلامی تصور	15
2- شمس الدین السخاوی بحیثیت مؤرخ	81
3- عرب و عجم میں مقام اقبال	101
4- دکتر علی شریعتی: شخصیت و تصانیف	135
5- ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار: یادیں، ملاقاتیں	179
6- عصر جدید میں ترکی زبان	197
7- مراجع و مصادر	205

تقدیم

ڈاکٹر سید خورشید رضوی

صدیقِ مکرم ڈاکٹر مظہر معین کے مجموعۂ مقالات ''منتخبات'' کی کمپوزنگ، اظہارِ خیال کے لئے، مجھے ایسے وقت میں موصول ہوئی ہے کہ میں ایک لمبے سفر کے لئے پا بہ رکاب ہوں۔ حواس باختگی کی اس کیفیت میں اِن علمی تحریروں سے بالاستیعاب استفادہ تو ممکن نہیں ہو سکا، البتہ امتثالِ امر کے لئے ایک سرسری سی نگاہ ڈالنے سے ہی ڈاکٹر صاحب کا تحقیقی ذوق اور مطالعے کا تنوع جو پہلے بھی محتاجِ ثبوت نہ تھا، مزید آشکار ہو کر سامنے آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے یہ مقالات گزشتہ کئی برس کے دوران مختلف ملکی وغیر ملکی مجلّات کی زینت بنے اور اب پہلی بار ایک مجموعے کی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر مظہر معین عربی زبان و ادب کے فاضل اُستاد اور ترویجِ عربی کے پُر جوش مبلغ ہیں۔ تاہم زیرِ نظر مقالات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ اُردو سے بھی کچھ کم تعلق خاطر نہیں رکھتے اور اُس کی ثروت میں پیہم اضافے کے خواہاں ہیں۔ اُردو اور اُس کے عقبی دیار سے علاقہ اِن چھ مقالات کا شیرازہ بند ہے۔

اوّلین مقالے میں شاعری کا اِسلامی تصور واضح کرنے کے لئے بطور پس منظر، قبل از اِسلام کی عربی شاعری اور عرب معاشرے میں اُس کی اہمیت پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اس سلسلے میں ابن عبدربہ، جاحظ، سیوطی، جرجی زیدان اور احمد حسن زیات جیسے قدیم و جدید عرب مصنفین کے اقتباسات جابجا پیش کئے گئے ہیں، جن سے مصنف کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

''شمس الدین السخاوی بحیثیت مؤرخ'' میں ایک کثیر الجہات شخصیت کے کمالات کو

اُجاگر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اکثر اپنے مقالات کے آخر میں ایک جامع تلخیص کے ذریعے سارے مبحث کا لب لباب پیش کرتے ہیں۔ اس مقالے کی تلخیص بطورِ خاص قابل ذکر ہے جس سے سخاوی کی جامع ومنفرد شخصیت کے گوناگوں پہلو، نہایت اختصار کے ساتھ اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

''عرب وعجم میں مقامِ اقبال'' اقبالیات کے سلسلے کی ایک مفید کاوش ہے جس میں برصغیر پاک وہند کے علاوہ عرب، ایران اور افغانستان کے چیدہ علماء، ادباء، مفکرین اور محققین کی آراء کی روشنی میں اقبال کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی پر مقالہ بہت معلومات افزا ہے جس میں اُن کے مختصر سوانح اور فکری ارتقاء کا جائزہ پیش کرتے ہوئے اگرچہ اُن کی آراء کو احتساب سے بالا تصور نہیں کیا گیا، تاہم اُن کی شخصیت کا نقش انقلاب ایران کی راہ ہموار کرنے والے فکری قائد کی حیثیت سے اُبھرتا ہے۔ ڈاکٹر علی شریعتی کی تصانیف ومقالات کی بھرپور فہرست بڑی محنت اور جستجو سے فراہم کی گئی ہے، جس سے اُن کی طبیعت کے تنوع اور نگاہ کی وسعت کا سراغ ملتا ہے۔ مقالے کے مطالعے سے بین السطور یہ واضح ہوتا ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے نام علی شریعتی کا پیغام یہ ہے کہ سب اپنے اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے دیگر مسالک کا احترام کرنے کا ظرف اور سامراجیت وصیہونیت کے مقابلے میں متحد رہنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی یادوں پر مشتمل دردمندانہ مضمون مرحوم سے مصنف کے گہرے تعلق خاطر کا غماز ہے۔ اس مضمون میں تحقیقی مقالے اور ادبی خاکے کا ایک اچھا امتزاج ملتا ہے۔ بعض بلیغ جملے یاد رہ جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، مثلاً یہ کہ ''وہ ایک خوددار اور خودکار انسان تھے''۔ جو لوگ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار سے ملے ہیں، وہ تصدیق کریں گے کہ اس تحریر میں اُن کی چلتی پھرتی شخصیت کا ایک سچا عکس محفوظ ہو گیا ہے، جس میں مرحوم کی مستقل مزاجی، جفاکشی، اخلاص، دیانت، دوست داری اور اسلامی شعائر سے گہری وابستگی کے ساتھ ساتھ روابط

باہمی میں اُن کی کڑی اصول پسندی کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے جسے لوگوں نے ''سخت گیری'' سے بھی تعبیر کیا، اگرچہ خود مصنف کو کبھی اس کا تجربہ نہیں ہوا۔

''عصر جدید میں ترکی زبان'' بقامت کہتر بقیمت بہتر'' کے مصداق، اختصار کے باوجود ایک مفید اور پُراز معلومات تحریر ہے۔

علمی مباحث میں اختلاف رائے کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور کسی بھی مصنف کے افکار و آراء کو بہ تمام و کمال قبول کر لینا ضروری نہیں ہوتا۔ تاہم تصنیف میں اگر علم و تحقیق کے بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھا گیا ہو تو اختلافِ رائے سے اُس کی اہمیت و افادیت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ ہمارے روز افزوں علمی انحطاط کے ماحول میں ڈاکٹر مظہر معین کے یہ عالمانہ نتائج قلم واقعی ''منتخبات'' کہلانے کے مستحق ہیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ ان کے مطالعے سے ہماری علمی و تحقیقی روایت آئندہ نسلوں کے ہونہار اور باصلاحیت افراد میں منتقل ہو سکے گی۔

عاجلانہ سی یہ سطور گو اِن مقالات پر تبصرے کا حق ادا نہ کر سکیں، راقم کو ایک علمی دستاویز کے خیر مقدم کا اعزاز ضرور عطا کرتی ہیں۔ میں ''منتخبات'' کی اشاعت پر ڈاکٹر مظہر معین اور اُن کے قارئین کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

لاہور: یکم جون 2010ء

خورشید رضوی

سابق رئیس شعبہ عربی و اُستاذ ممتاز

(Distinguished Professor)

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

تعارفِ کتاب

جسٹس (ر) نذیر احمد غازی

زندگی بھر مطالعہ میں گزارنے کے بعد عقل میں ایک ٹھہراؤ سا آجاتا ہے اور پھر بسا اوقات یہ ٹھہراؤ ایک سمت کی جانب اپنا رُخ موڑتا ہے تو خیالات کا ایک غیر محسوساتی سیلاب اُمڈ آتا ہے، اس فیضان لاشعوری کے تھماؤ کے لئے یا تو مجلس ہم خیالاں درکار ہوتی ہے یا پھر قلم کا آلہ نئے فکری زاویوں کی ترتیب میں معاون ہوتا ہے۔ قلم کی اہمیت ابتدائے تخلیق ہی سے واضح کر دی گئی تھی اور تعلیم و تعلم کے سلسلے میں قلم کی بنیادی حیثیت وحی اول میں پیغام اول کے طور پر پوری طرح سمجھادی گئی ہے۔ اس لئے ہمارے علمی رویوں میں قلمکاری کی حقیقت کو مسلمہ قرار دیا گیا ہے۔

جب طالب علم قلم اُٹھاتا ہے تو وہ اپنے خیالات کی پختگی کے لئے مشق کرتا ہے اور جب اُستاد قلم سنبھالتا ہے تو وہ اپنے افکار کی پختگی کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ اُستاد کا اظہار چراغ روشن کی مانند ہے اور یہ چراغ راہ، طریق علم میں پیش آمدہ گھاٹیوں کے وجود پر سے پردہ سیاہ کو ہٹاتا ہے اور حقیقت آشنا کرتا ہے۔ طالب علم کا قلم برائے مشق طے شدہ، دیکھے راستوں پر سفر کرتا ہے اور اُستاد کا قلم ان دیکھے راستوں پر بھی بر بنائے تجربہ، عادی سوار کی طرح سیر کرتا ہے اور روشنی بکھیرتا جاتا ہے، منزلیں قریب کرتا جاتا ہے اور فضائے فکر میں اعتماد کی نسیم صبا کی خیرات بانٹتا ہے۔

اسی لئے بزرگوں نے بچپن میں نصیحت کی تھی کہ کتاب پڑھنے سے پہلے کتاب کا جغرافیہ اور حرفوں کا نسب جان لیا کرو اور خام قلمکار کی کتاب کو پس فکر ڈالنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ہاں اگر کسی اُستاد کی کتاب ملے تو اسے پیش نظر ہی نہیں، پیش فکر بھی رکھو کیونکہ اس کتاب میں اُستاد نہیں اُستاد کا تجربہ بولتا ہے اور ایسا اُستاد جس نے دور طالب علمی میں کشکول طلب کو ہمیشہ سیدھا ہی رکھا ہو، جدید افکار کی چاشنی سے مشام جاں شیریں کئے ہوں، قدیم علماء کی کفش برداری کے طور اپنائے

ہوں، خانقاہوں کے لذت اسرار کے ذائقہ سے بھی آشنا ہو، ملی تحریکوں میں بنفس شریف وہ وجود نحیف سرگرم عمل رہا ہو، تو ایسا اُستاد فرادو اجتماع سے براہِ راست عمیق فکری و علمی رابطہ رکھتا ہے۔

ڈاکٹر مظہر معین کے جامع اور حوالہ بردار مضامین میں ہر کوشش منزل اثبات کی جانب رواں ہے۔ اپنی محنت و محبت کے طلسم سے انہوں نے ہر تحریر کو زر خالص بنانے کی کوشش فرمائی ہے۔ اُن کی یہ کاوش ایک راہ جدید ہے، نوعمر محققین کے لئے نشان منزل ہے اور متنوع الموضوعات اہل قلم کے لئے حوصلہ سامانی ہے۔ مختلف ادوار میں تحریر کردہ یہ مضامین ایک جہان تازہ کی خبر دیتے ہیں۔

یہ کتاب دوران مطالعہ میرے مرکز فکر پر اس وقت مسلط ہوگئی جب میں نے اقبال اور تر کی زبان کے متعلق مضامین کے علاوہ علی شریعتی پر بالتفصیل خیالات محررہ کا مطالعہ کیا۔ اقبال کے بارے میں تو مجھے کچھ زیادہ وضاحت سے رقم نہیں کرنا ہے، کیونکہ اقبال کے کلام منظوم اور ان کی نثری تحریرات میں غلبہ اسلام کے لئے فکری بیداری و عملی جہد کے لوازمات پر سیر حاصل ارشادات اور وضاحتیں موجود ہیں اور برصغیر کے ہر صاحب درد و ذوق کتاب خوان کے لئے ان تک رسائی نہایت آسان ہے، لیکن علی شریعتی جو درحقیقت اقبال ہی کا فیضان یافتہ ہے، عصر جدید میں اسلامی انقلاب کی عملی تعبیر کے دور میں فکر نشانی کر رہا ہے نیز مغرب کی شاطرانہ سازشوں کے نتیجے میں اہل تسنن و تشیع کے مابین بُعد فکری و سیاسی میں اضافہ کے باوجود علی شریعتی اپنے تجدیدی افکار میں فکر مدرسہ سے ہٹ کر وسیع تر مکتب فکر کی جانب لوٹا ہے اور اعدائے اسلام کے مقابلے میں اتحاد اُمت کا علمبردار ہے۔

ملت اسلامیہ کا جغیوا تہران ہو؟ اور خلافت کے احیاء کے لئے کون سا خطہ منتخب ہو؟ مغرب سے ہماری ثقافتی آہنگی کس درجہ ہو؟ ہماری ثقافتی جنگ کا اختتام کیسے ہوگا؟ یا پھر تہذیبی ٹکراؤ کا نقطہ ابتدا کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ، مندرجہ بالا سوالات ہمہ وقت ہمارے بیدار فکری دروازوں پر جواب طلبی پر آمادہ رہتے ہیں۔ ہمارے قائدین فکری ہوں یا سیاسی اپنے مخصوص علمی

تناظر کے سبب ان کا کماحقہ احاطہ کرنے سے قاصر ہیں، تاہم یہ حقیقت نا قابل تردید ہے کہ کسی بھی بین الملل فکری تہذیب میں زبان کا حصہ بہت ہی مرکزی ہوتا ہے کیونکہ یہ اس کی ایک علمی، ثقافتی اور معاشرتی ضرورت ہے۔ثقافت اِسلامیہ میں قدیم وجدید ترکی کا کردار بہرحال قابل ملاحظہ ہے اور ہماری تاریخ وجغرافیہ میں ترکستان اور ترک ثقافت کے علاوہ ترکی زبان کی وسعت اور عربیت کی قربت نے ثقافت اسلامیہ کا ایک عصری نہج مہیا کیا ہے۔ ڈاکٹر مظہر معین نے ترکی زبان پر جو معلومات فراہم کی ہیں اگر چہ ان کے ذوق علمی کی آئینہ دار ہیں۔لیکن فی الحقیقت قدیم سے جدید کے سفر میں ہماری دلیل ثقافت (Cultural Guide) قرار پاتی ہے۔قارئین اس مضمون میں اِسلامی ثقافت کے بارے میں نئی مثبت آرا قائم کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

اس کتاب ”منتخبات“ کا ہر مضمون واقعی منتخب ہے۔عربی اسلامی شاعری پر ایک تحریر وجیز نے ہمارے اس حلقے کو چشم کشائی کا ایک تعجب خیز موقع فراہم کیا ہے جو شاعری کے بارے میں حسن ظن سے کام نہیں لیتا، بلکہ اپنی ذہنی تعبیرات کو راہ مستقیم بتلاتا ہے اور ذوق سلیم سے عاری ہے۔ شخصیات پر لکھی گئی تحریروں میں خوبی اسلوب جاذب نظر اور ذوق وشوق میں اضافہ باعث ہے۔

یہ کتاب اگر چہ ایک فرد کا فکری وتحقیقی اثاثہ علم ہے لیکن بہت سے اہل فکر ونظر کے لئے نئی راہیں سجھانے کی ایک عمدہ اور دلپذیر علمی کاوش ہے۔

نذیر احمد غازی
سابق جسٹس
لاہور ہائی کورٹ، لاہور

عرضِ مؤلف

الحمد لله الذي علّم بالقلم، والصلوة والسلام على من بُعث معلّماً، وعلى خلفائه وأزواجه وأولاده وأصحابه نجوم العلم والحِكَم، وبعد :

اُردو زبان کو برصغیر پاک و ہند کے سوا ارب سے زائد باشندوں کی علمی، ادبی اور رابطہ زبان بنانے میں جہاں اُردو ہندی مشترک لسانی ڈھانچے نے بنیاد فراہم کی، وہیں مشترک عربی رسم الخط میں لکھی جانے والی عربی، فارسی اور ترکی (عثمانی) زبانوں نے منت پذیر شانہ گیسوئے اُردو کی آرائش و زیبائش میں مادرِ مہربان کا کردار اس شان سے ادا کیا کہ ہر سو اُردو زبان و ادب کی دھوم مچ گئی۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

1947ء میں تقسیم برصغیر کے بعد اگرچہ اُردو زبان جو خیبر سے راس کماری تک اور کلکتہ، ڈھاکہ، حیدر آباد دکن سے رام پور، بھوپال اور دہلی تک غالب و رائج تھی، سیاسی کشمکش کی زد میں آ گئی، مگر آج بھی ذرائع ابلاغ بالخصوص فلم، ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ نیز رابطہ باہم کے لئے اُردو (یا اُردو ہندی مخلوط) زبان ہی غالب و مقبول عام ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اکیسویں صدی کے حالات کے تناظر میں اُردو زبان کو اپنے بنیادی لسانی عناصر عربی، فارسی، ہندی، ترکی اور علاقائی زبان و ادب سے حتی الامکان مربوط رکھا جائے۔ اس حوالہ سے ایک عملی پیش رفت چند برس پہلے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے شعبہ اُردو میں پی ایچ ڈی اور ایم فل کے نصابات میں عربی، فارسی اور ہندی کی شمولیت کے بعد ایم۔ اے اُردو میں عربی و فارسی کے لازمی مضمون اور ہندی کے اختیاری مضمون کا اضافہ ہے۔ چند سال پہلے حیدر آباد دکن میں ''ابو الکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی'' کا قیام بھی اسی سلسلہ فروغ اُردو کی ایک اہم کڑی ہے۔

اسی طرح مصر، ایران، ترکی اور دیگر عربی، فارسی اور ترکی دان ممالک میں اُردو زبان و

ادب کی تدریس وتعلیم بھی روز افزوں ہے۔اس حوالہ سے جامعة الازهر، جامعة القاهرة ، جامعة عين شمس، جامعة الاسكندريه، جامعه استنبول اور دانشگاه تهران کے شعبہ ہای اُردو بطور خاص قابل ذکر ہیں۔اسی طرز پر شعبہ پنجابی اورینٹل کالج کے ایم۔اے کے نصابات میں عربی، فارسی قواعد اور گورمکھی رسم الخط کی شمولیت نیز بھارتی پنجاب کی یونیورسٹیوں کے ایم۔اے پنجابی کے نصابات میں ''پاکستانی پنجابی زبان وادب'' کے زیرعنوان عربی رسم الخط (شاہ مکھی) میں پنجابی ادب کی تدریس ہے۔

اسی مربوط سلسلہ اُردو زبان وادب کی ایک کڑی زیرنظر کتاب ہے، جو ان متنوع مقالات پر مشتمل ہے جو راقم الحروف نے مختلف ماہ وسال میں تحریر کئے اور اندرون وبیرونِ ملک کے بعض تحقیقی و ادبی مجلّات میں شائع ہوئے۔چونکہ ان مقالات کا تعلق عربی، فارسی، اُردو اورتر کی زبان وادب سے تھا اور بطور مجموعی اُردوزبان میں تحریر شدہ تھے،لہٰذا ان مقالات کو مختلف قارئین کی جانب سے حوصلہ افزائی کے بعد کتابی شکل میں یکجا کرنے کا ارادہ کیا گیا اور بالآخر نظر ثانی کے بعد ضخیم تر صورت میں یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔اس کتاب کی ''کلیہ علوم شرقیہ'' کی جانب سے اشاعت کا ارادہ پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر (سابق ڈین کلیہ علوم شرقیہ) نے کیا اور رئیس جامعہ پنجاب پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران کی اُردو زبان وادب اور السنہ شرقیہ سے عقیدت و وابستگی نے جامعہ پنجاب کے نفقہ پر اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

گر قبول اُفتد زهے عزو شرف

لاہور: ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ/۶ جون ۲۰۱۰ء مظہر معین

۱۔ شاعری کا اِسلامی تصور

شاعری کا اِسلامی تصور

شعر قدیم زمانوں سے عرب معاشرے میں اپنے اثر ونفوذ اور دل نشینی کے لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ بعثت نبوی سے قبل کے دور میں جسے اصطلاحاً ''العصر الجاہلی'' یا زمانہ جاہلیہ کا نام دیا جاتا ہے، شاعری اہل عرب کی تمام سرگرمیوں کے لئے محور وبنیاد کی حیثیت رکھتی تھی۔ آج تک اس دور کے عظیم شعراء امرؤ القیس، زہیر بن ابی سلمی، عمرو بن کلثوم، نابغہ ذبیانی اور دیگر حضرات کے کہے ہوئے قصائد عربی ادب کا بہترین اور اولین سرمایہ قرار پاتے ہیں، جن کی رفعت وعظمت کے سامنے امتداد زمانہ، گردش دوران اور ارتقائے افکار کے باوجود ہر دور کے ادب شناسوں نے سر تسلیم خم کیا ہے۔ جاہلی دور میں شاعری کے مقام و اہمیت کے بارے میں مشہور اندلسی ادیب اور مورخ ابن عبد ربہ نے ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے:

> ''کان الشعر دیوان خاصة العرب والمنظوم من کلامها، والمقیّد لأیامها و الشاهد علی حکامها، حتی بلغ من کلف العرب به وتفضلیها له أن عمدت إلی سبع قصائد خیّرتها من الشعر القدیم فکتبتها بماء الذهب فی القباطی المدرجة وعلقتها فی أستار الکعبة''.[1]

ترجمہ: ''شاعری عربوں کے خواص کا دیوان اور اُن کا کلام منظوم، نیز ان کی جنگوں اور ایام کو محفوظ کرنے والی اور اُن کے حکام کی شاہد تھی، یہاں تک کہ عربوں کا شاعری کے سلسلے میں اہتمام اور ترجیح اِس حد تک پہنچ گئی کہ اُنہوں نے قدیم شاعری میں سے سات قصیدوں کا انتخاب کیا اور اُنہیں قبطی (مصری) ریشمی کپڑے پر سونے کے پانی سے لکھ کر کعبہ کے پردوں سے لٹکا دیا''۔

آگے چل کر ابن عبدربہ نے ''فضائل الشعر'' کے زیرعنوان یوں لکھا ہے:

''ومن الدليل على عظم قدر الشعر عندالعرب وجليل خطبه في قلوبهم انه لما بعث النبي صلى الله عليه وسلم بالقرآن المعجز نظمه المحكم تاليفه وأعجب قريشًا ماسمعوا منه قالوا: ما هذا الاسحر. وقالوا في النبي صلى الله عليه وسلم: ''شاعر نتربص به ريب المنون''. (2)

ترجمہ: ''اورعربوں کے ہاں شاعری کی عظیم قدر وقیمت اوراُن کے دلوں میں اس کی جلالت شان کی یہ دلیل ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کواُس قرآن کے ساتھ مبعوث کیا گیا جس کا نظم معجزہ ہےاورجس کی تالیف محکم ہے اورقریش نے اُس میں سے جوسنا، وہ انہیں نہایت عمدہ لگا،تو وہ کہنے لگے: یہ تو ساحری ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہنے لگے: یہ شاعر ہیں جن کے بارے میں ہم گردشِ زمانہ کے منتظر ہیں''۔

جاہلی معاشرہ میں شاعر کا وجودبھی اتناہی اہم تھا جتنا کہ سربراہ قبیلہ کا اور جس طرح دورِ جدید میں مختلف انتظامی امور کی تربیت کے لئے اکیڈیمیاں قائم کی جاتی ہیں،عملاً ہرقبیلہ اپنے کچھ افرادکوشاعری کی باقاعدہ تربیت دے کر اپنی سرفرازی کا سامان مہیا کرتا تھا۔شاعر کا وجوداس قدر اہمیت کا حامل تھا کہ کسی قبیلہ میں اس کے نمودار ہونے پر بھرپور جشن منایا جاتا اور خوشی کے اس موقع پر متعلقہ قبیلہ دامے درمے قدمے سخنے ہر لحاظ سے اس مبارک موقع کوشایان شان طریقے سے مناتا۔ اس بارے میں مشہورعرب عالم اورمصنف جلال الدین سیوطی نے ابن رشیق کے حوالے سے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے:

''وكانت القبيلة من العرب اذا نبغ فيها شاعر، أتت القبائل فهنأتها بذلك، وصنعت الأطعمة واجتمع النساء يلعبن بالمزاهر كما يصنعن في الأعراس، وتتبا شرالرجال والولدان لأنه حماية لأعراضهم وذب عن أحسابهم

وتخليد لمآثرهم وإشادة لذكرهم، وكانوا لايهنئون إلابغلام يولد أو شاعر ينبغ فيهم أو فرس تنتج". [3]

ترجمہ: ''عربوں کے کسی قبیلہ میں جب کوئی شاعر نمودار ہوتا تو دوسرے قبیلے آکر اس بات کی مبارک باد دیتے اور کھانے پکائے جاتے اور عورتیں جمع ہوکر سازوں کے ساتھ کھیل تماشا کرتیں، جیسا کہ وہ شادی بیاہ میں کرتی ہیں نیز مرد اور بچے آپس میں ایک دوسرے کو خوشخبری دیتے کیونکہ شاعر اُن کی عزتوں کا محافظ اُن کے حسب نسب کا دفاع کرنے والا، اُن کے آثار وروایات کو دوام بخشنے والا اور اُن کے ذکر کو تقویت دینے والا ہوتا تھا اور وہ لوگ کسی بات پر مبارکباد نہیں دیتے تھے سوائے لڑکا پیدا ہونے یا شاعر نمودار ہونے یا گھوڑے کا بچہ پیدا ہونے پر''۔

گویا کہ شاعر قبیلہ کی عزت کا نگہبان، حسب ونسب کا محافظ، ان کے کارناموں کو شعر کی صورت میں حیات ابدی اور ان کے تذکرے کو دوام بخشنے والا تھا۔ مگر ان کے شاعر کو اہمیت دینے کی وجہ صرف یہی نہ تھی کہ وہ بہت سے معاملات میں زبان شاعر کے محتاج تھے، بلکہ اس لئے بھی کہ وہ ایک شعر شناس اور شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھنے والی، فصاحت وبلاغت سے مالا مال قوم کے فرزند تھے۔ چنانچہ ''معلقات'' کا کعبہ کے پردوں سے لٹکایا جانا ان کے ذوق شعر اور حسن انتخاب کی ایک بیّن دلیل ہے۔

جاہلی معاشرے میں شعر اور شاعر کی اہمیت کے بارے میں عصر جدید کے مورخین عربی ادب نے بھی قدیم اصحاب کی آراء سے اتفاق کیا ہے۔ اس بارے میں مشرق ومغرب کے بعض علماء کی آراء درج ذیل ہیں، جو جاہلی دور میں شاعری کے مرکزی مقام اور شاعر کی اہمیت پر جامع انداز میں روشنی ڈالتی ہیں۔ جرجی زیدان اپنی کتاب ''تاریخ آداب اللغة العربية'' میں لکھتے ہیں:

''كانوا يتخذون الشعراء واسطة في الاسترضاء او الاستعطاف ويجعلونهم وسيلة لإثارة الحروب فيكون

الشاعر لسان حال القبيلة يعبر عن غرضها وينطق بلسانها شأن الصحف الرسمية اليوم. فإنّ الصحيفة الرسمية إذا قالت قولاً علم الناس أن الحكومة تريده. وهذا هو سبب ماكان يظهر من تاثير الشعر فی السياسة. ولذلک فالقبيلة مطالبة برعاية شاعرها والقيام بما يحتاج اليه أو إكرامه و تقديمه". (4)

ترجمہ: ''عرب شاعروں کوکسی کو راضی کرنے یا مہربان کرنے کے لئے وسیلہ بناتے تھے نیز انہیں جنگوں کی آگ بھڑکانے کا ذریعہ بناتے تھے، پس شاعر قبیلے کی زبانِ حال ہوتا تھا جواُن کے مقصد کی ترجمانی کرتا تھا اوراُن کی زبان بولتا تھا جیسا کہ آج کل سرکاری گزٹ اوراخبار کرتے ہیں، کیونکہ سرکاری اخبار جب کوئی بات کہتے ہیں تو لوگ جان جاتے ہیں کہ حکومت ایسا کرنا چاہتی ہے اور یہی وہ سبب ہے جو سیاست میں شاعری کا اثر ظاہر کرنے کا باعث ہے، اسی لئے ہر قبیلہ اپنے شاعر کی دیکھ بھال اوراُس کی ضرورتوں کو پورا کرنے نیز اُس کی تکریم وتقدیم کا خواہش مند ہوتا تھا''۔

ایک اورعرب مورخ احمدحسن زیات کا کہنا ہے:

''العرب أشعر الساميين فطرة و أبلغهم على الشعر قدرة لاتساع لغتهم للقول وملاءمة بيئتهم للخيال وصفاء قريحتهم وسذاجة معيشتهم وقوة عصبيتهم وكمال حريتهم وخلو جزيرتهم مما يصدّ الفكر عن التأمل ويعوق الذهن عن التفكر، فهم بين الصحراء والسماء فی فضاء من اللانهاية يملأ الذهن والنفس خيالاً و جلالاً و روعة، وهم فوق ذلک ذوو نفوس شاعرة و طباع ثائرة، يستفزهم الرغب والرهب

ویزدهیهم الطرب والغضب، فلم یترکوا شیئًا یجول فی النفس أویقع تحت الحس إلا نظموه، فکان الشعر دیوان علومهم وحکمهم وسجل وقائعهم وسیرهم وشاهد صوابهم وخطئهم ومادة حوارهم وسمرهم، وکانوا کلهم یروونه وجلّهم یقرضونه عفو البدیهة وفیض الخاطر حتی روی عنهم من الشعر الوجدانی مالم یرو عن أمة من أمم الأرض مثله، فلا بدع إذا کان الشاعر یغویهم ویرشدهم والبیت الواحد یقیمهم ویقعدهم۔''[5]

ترجمہ: ''عرب تمام سامی اقوام میں فطری لحاظ سے شاعری میں بڑھ کر ہیں اور شاعری پر قدرت کے لحاظ سے اُن سب سے بلیغ تر ہیں کیونکہ اُن کی زبان کلام کے لئے نہایت وسیع ہے اور اُن کا ماحول ،تصور وخیال کے لئے مناسب تر ہے اور اُن کے مزاج صاف شفاف ہیں اور اُن کی معیشت سادہ ہے اور اُن کی عصبیت قوی ہے اور آزادی درجۂ کمال پر ہے اور اُن کا جزیرۃ العرب ان تمام رکاوٹوں سے خالی ہے جو دماغ کو غور وفکر سے روکتی ہے اور ذہن کو سوچ بچار سے منع کرتی ہے۔ پس وہ صحرا اور آسمان کے درمیان ایک ایسی لا متناہی فضا میں ہیں جو ذہن اور نفس کو خیال وجلال وجمال سے بھر دیتی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ حساس دلوں اور پُر جوش مزاجوں کے لوگ ہیں جنہیں رغبت وخوف مضطرب کرتے ہیں اور طرب وغضب مغرور بناتے ہیں۔ پس اُنہوں نے ہر اُس چیز کو جس کا تعلق قلب واحساس سے ہے، کلام میں ڈھال دیا۔ پس شاعری اُن کے علوم واقوالِ حکیمانہ کا دیوان اور اُن کے واقعات اور سیرتوں کا رجسٹر اور اُن کے صحیح اور غلط کی شاہد اور اُن کی بات چیت اور محفل شب کا مواد تھی۔ وہ سب راویانِ شعر تھے اور اُن کی اکثریت فی البدیہہ اور جوش طبیعت کی بنا پر شاعری کرتی

تھی، یہاں تک کہ اُن سے وجدانی شاعری کے سلسلے میں اتنا کچھ روایت کیا گیا جس کے مثل اقوامِ عالم میں سے کسی قوم سے روایت نہیں کیا گیا، لہٰذا تعجب کی کوئی بات نہیں اگر شاعر اُن کو بہکاتا اور راستہ دکھاتا تھا اور ایک شعر اُنہیں لا کھڑا کرتا یا بٹھا دیتا تھا''۔

شعر جاہلی اور اس کی ادبی قدر و قیمت کے بارے میں مشہور مغربی مورخ فلپ کے حِتّی نے بھی اپنی تصنیف میں بڑی جامع رائے قلمبند کی ہے:

"It was only in the field of poetical expression that the pre-Islamic Arabian excelled. Herein his finest talents found a field. The Bedouin's love for poetry was his one cultural asset." (6)

حِتّی مزید لکھتے ہیں:

Arabic literature like most literatures, sprang into existence with an outburst of poetry, but unlike many others, its poetry seems to have issued forth full-grown. The oldest pieces of poetry extant seems to have been composed some one hundred and thirty years before the Hijrah in connection with the war of al-Basus, but their odes, with their rigid conventions, presuppose a long-period of development in the cultivation of the Art of expression and innate capacities of the language. The poets of the middle part of the sixth century have never been surpassed." (7)

جاہلی معاشرے میں شاعر کی عظمت واہمیت کے بارے میں فلپ کے حتّی کا کہنا ہے:

As his office developed, the poet acquired a variety of functions. In battle his tongue was as effective as his people's bravery. In peace he might prove a meance to public order by his fiery harangues. His poems might arouse a tribe to action in the same manner as the tirade of a demagogue in a modern political compaign. As the press agent, the journalist of his day, his favour was sought by princely gifts, as the records of the courts of Hira and Ghassan show. His poems, committed to memory and transmitted from one tongue to another, offered an invaluable means of publicity. He was both moulder and agent of public opinion. Qat'al-Lisan (cutting of the tongue) was the formula used for subsidizing him and avoiding his satires.

Besides being oracle, guide, orator and spokesman of his community, the poet was its historian and scientist, in so far as it had a scientist. Bedouin measured intelligence by poetry. "Who dare dispute

my tribe, its pre-eminence in horsemen, poets and number" exclaimed a bard in al-Aghani. In these three elements, military power, intelligence and numbers, lay the superiority of a tribe. As the historian and the scientist of the tribe, the poet was well-versed in its genealogy and folklore, cognizant of the attainments and past achivements of its members, familiar with their rights, pasture-lands and border-lines. Furthurmore as a student of the psychological weaknesses and historical failures of the rival tribes it was his business to expose the short-comings and hold them upto ridicule.." (8)

جاہلی معاشرہ میں شاعر کی عظمت و اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کے بعد حتی نے جاہلی شاعری کی تاریخی اور علمی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے۔ جس سے جاہلی شاعری کی دورِ جاہلیہ میں اہمیت کے علاوہ اس کی ایک مستقل تاریخی تحقیقی اور لغوی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔

"Aside from its poetic interest and the worth of its grace and elegance, the ancient poetry, therefore has historical importance as source-material for the study of the period in which it was composed. In fact it is our only quasi-contemporaneous data. It throws

> light on all phases of pre-Islamic life. Hence the adage" poetry is the public register (Diwan) of the Arabians." (9)

ادب عرب سے تعلق رکھنے والے ان جید علماء کی آراء سے جن میں دورِ قدیم وجدید ہر دور کے اصحاب شامل ہیں، اس رائے کی بڑی تفصیل سے اور دوٹوک انداز میں تائید ہوتی ہے کہ عرب کے جاہلی معاشرہ میں شاعری اور اس کے حوالے سے شاعر کو مرکز ومحور کی حیثیت حاصل تھی۔شاعری اس دور میں کم وبیش وہی حیثیت رکھتی تھی جو قدیم مذاہب کے پیروکاروں کے ہاں ان کی کتب مقدسہ کو حاصل تھی۔شاعری اس قبائلی معاشرے کی روح، عربوں کی تہذیب وثقافت کی اساس اور ان کا تاریخی و ادبی سرمایہ تھی۔ ہر قبیلہ کی عزت ورسوائی کا مدار اس کے شعراء کی قابلیت پر تھا، حتیٰ کہ جنگوں میں فتح وشکست کا دارومدار بھی بہت حد تک اس بات پر تھا کہ کسی قبیلہ کا شاعر (یا شعراء) افرادِ قبیلہ کی غیرت اور گروہی عصبیت کو بھڑکانے میں کس حد تک آتش نوائی سے کام لیتا ہے۔بطورِ مجموعی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جاہلی دور میں شاعری ہی قبیلے کی تمام تر سرگرمیوں کا مرکز ومحور اور سنگِ بنیاد تھی، نیز یہ شاعری زبان وبیان اور فصاحت و بلاغت ہر لحاظ سے اس پایہ کی تھی کہ گزشتہ چودہ صدیوں کے ہر دور میں اسے اعلیٰ ترین نمونے اور عربی شاعری کے آئیڈیل کی حیثیت حاصل رہی۔آج تک اس بارے میں عربی زبان وادب کے علماء کی غالب اکثریت کا اتفاق ہے کہ جاہلی شاعری کے بلند معیارات کو گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال میں مات نہیں کیا جا سکا اور آئندہ بھی اس کا کوئی امکان نہیں۔اس حقیقت کو حِتّی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "The early Muslim poets as well as the later and the present day versifiers regarded and still do regard the ancient productions as models of unapproachable excellence." (10)

عرب معاشرے میں شاعری بدستور عظیم الشان حیثیت کی حامل رہی، یہاں تک کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر چالیس برس کی عمر میں نزول قرآن کا سلسلہ شروع ہوا اور آپ نے اعلان نبوت فرما کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا شروع کی۔ چنانچہ تئیس برس کی مدت میں اسلام سرزمین عرب پر غالب آ گیا۔ قرآن پاک کے نزول نے اپنی ابتداء ہی سے عربوں کی فصیح و بلیغ زبانوں کو گنگ اور ان کی عقلوں کو حیران کر دیا۔ حتیٰ کہ نثر تو در کنار وہ عظیم الشان شاعری بھی جو ان کا حاصل زیست تھی، قرآن کی معجز بیانیوں اور فصاحت و بلاغت کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور اللہ تعالیٰ نے علی الاعلان عربوں کی فصاحت و بلاغت کو دوٹوک انداز میں چیلنج کر کے ساتھ ہی فیصلہ بھی سنا دیا۔

''وإن كنتم في ريب مما نزّلنا على عبدنا فأ توا بسورة من مثله وادعوا شهداء كم من دون اللّٰه إن كنتم صدقين. فإن لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التي وقودها الناس والحجارة أعدّت للكافرين''۔ (11)

ترجمہ: اور اگر تم اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے شک میں ہو تو اس جیسی ایک سورہ ہی بنالاؤ اور اپنے تمام شاہدین کو بھی بلا لو، جو اللہ کے علاوہ ہیں اگر تم سچے ہو، پس اگر تم ایسا نہ کر پاؤ اور تم ہرگز ایسا نہیں کر پاؤ گے تو اُس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں جو کفر و انکار کرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

چنانچہ عربوں کی اجتماعی کوششیں بھی قرآن کے مقابلے میں ایک مختصر سورہ گھڑ کر نہ لا سکیں اور قرآن نے شاعری کو شکست دے کر اپنی عظمت مشرکین عرب سے منوا لی۔ تمام لوگوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ قرآن عربوں کی شاعری سے برتر و عظیم تر ہے۔ پس نزول قرآن نے شاعری کی عظیم الشان حیثیت کو بری طرح متاثر کیا اور مشرکین عرب قرآن کی ادبی برتری کو تسلیم کرنے پر چار و نا چار مجبور ہو گئے۔ اب ترتیب یوں تھی، اول قرآن اور پھر شاعری۔ یہ گویا شاعری

کے تنزل کی ابتداء تھی۔

قرآن نہ شعر تھا نہ مقفی و مسجع نثر جس کا عربوں کے ہاں رواج تھا، مگر وہ جو کچھ بھی تھا، بہر حال شعر ونثر دونوں سے برتر واعلیٰ، عربی زبان وادب کا بلندترین معیار قرار پایا۔ جلال الدین السیوطی اپنی کتاب ''المزہر'' میں قرآن کی عظمت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فکما أن القرآن أعجز الشعراء وليس بشعر، كذلك أعجز الخطباء وليس بخطبة و المترسلين وليس بترسل، و إعجازه الشعراء أشدّ برهاناً. ألا ترى العرب كيف نسبوا النبي صلى اللّٰه عليه وسلم إلى الشعر لما غلبوا وتبيّن عجزهم فقالوا: هو شاعر، لما في قلوبهم من هيبة الشعر و عجامته وأنه يقع منه مالا يلحق، و المنشور ليس كذلك، فمن هنا قال تعالىٰ (وما علّمنه الشعر وماينبغي له) اى لتقوم عليكم الحجة ويصح قبلكم الدليل''۔ (12)

ترجمہ: پس جس طرح قرآن نے شاعروں کو عاجز کردیا، حالانکہ وہ شاعری نہیں ہے اُسی طرح خطیبوں کو بھی عاجز کردیا حالانکہ وہ کوئی خطبہ نہیں ہے اور نثر لکھنے والوں کو بھی حالانکہ وہ کلامِ منثور نہیں ہے اور قرآن کا شاعروں کو عاجز و مغلوب کردینا زیادہ بڑی دلیل وبرہان ہے۔ کیا تو نے عربوں کو نہیں دیکھا کہ اُنھوں نے کس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعری کی طرف منسوب کیا، جبکہ وہ مغلوب ہو گئے اور اُن کا عجز ظاہر ہوگیا، تو وہ کہنے لگے: آپؐ شاعر ہیں کیونکہ اُن کے دلوں میں شاعری کی ہیبت و دہشت تھی نیز اس لئے کہ اس میں وہ کچھ ہے جو بے مثال ہے جبکہ نثر کی وہ حیثیت نہیں، پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اور ہم نے انہیں شاعری کی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی یہ انؐ کے شایانِ شان ہیں) تا کہ تم پر حجت قائم ہوجائے اور تمہارے لئے دلیل درست

ثابت ہو۔

پھر بات یہیں تک محدود نہ رہی، بلکہ وحی قرآنی کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر ہونے والا کلام بھی عربوں کی نثر و نظم کے لئے ایک دوسرا چیلنج ثابت ہوا۔ حتیٰ کہ شاعری اس کلام نبوت کا مقابلہ نہ کر سکی، جو شاعری اور مقفّی و مسجع نثر کی خوبیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا، ادبی معیاروں کی بلندیوں کو چھو رہا تھا مگر نہ شعر تھا نہ روایتی سجع کہان۔ فصاحت کلام نبوی کے بارے میں مشہور عرب ادیب جاحظ کا بیان ہے:

''هو الكلام الذى قلّ عدد حروفه، وكثر عدد معانيه، وجل عن الصنعة ونزّه عن التكلّف وكان كما قال الله تبارك وتعالٰى: قل يامحمد ''وما أنا من المتكلّفين''. فكيف وقدعاب التشديق وجانب أصحاب التقعير، واستعمل المبسوط في موضع البسط والمقصور في موضع القصر، وهجر الغريب الوحشي ورغب عن الهجين السوقي، فلم ينطق الاعن ميراث حكمة، ولم يتكلّم إلابكلام قدحفّ بالعصمة، وشيّد بالتائيد، ويسّر. بالتوفيق-

وهذا الكلام الذى ألقى الله المحبة عليه وغشّاه بالقبول وجمع له بين المهابة والحلاوة، وبين حسن الإفهام وقلة عدد الكلام، ومع استغنائه عن إعادته وقلة حاجة السامع إلى معاودته، لم تسقط له كلمة، ولا زلّت له قدم ولا بارَت له حجة، ولم يقم له خصم، ولا أفحمه خطيب بل يبذّ الخطب الطوال بالكلام القصير، ولايلتمس إسكات الخصم إلا بما يعرفه الخصم، ولا يحتج الا بالصدق، ولا يطلب الفلج إلا

بالحق، ولا يستعين بالخلابة ولايستعمل المواربة، ولايهمز ولايلمز، ولا يبطي ولا يعجل، ولا يسهب ولا يحصر. ثم لم يسمع الناس بكلام قط أعم نفعًا ولا أصدق لفظًا ولا أعدل وزناً ولا أجمل مذهباً ولا أكرم مطلباً ولا أحسن موقعاً ولا أسهل مخرجاً ولا أفصح عن معناه ولا أبين في فحواه من كلامه صلى الله عليه وسلم كثيراً". (13)

ترجمہ: وہ ایسا کلام ہے جس کے الفاظ کی تعداد کم اور معانی ومفاہیم انتہائی زیادہ ہیں۔ وہ تصنع سے برتر اور تکلف سے مبرا ہے اور اللہ تعالٰی کے اس فرمان کا مصداق ہے کہ اے محمدؐ، کہہ دیجئے: میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

اور آپؐ پُرتکلف گفتگو کیسے فرما سکتے تھے جبکہ آپ نے بتکلف فصاحت ظاہر کرنے کے لئے منہ پھاڑ کر گفتگو کرنے کو ناپسند فرمایا اور دورانِ گفتگو چیخنے چلانے والوں سے دوری اختیار فرمائی۔

آپؐ نے تفصیل طلب مقام پر تفصیلی کلام فرمایا اور اختصار طلب موقع پر اختصار سے گفتگو فرمائی، عجیب و نامانوس الفاظ وکلام سے اعراض کیا اور قبیح وسوقیانہ کلام سے اجتناب فرمایا۔ آپؐ نے ہمیشہ حکمت ودانائی کی بات ہی فرمائی اور ایسا کلام ارشاد فرمایا جو محکم ومحفوظ، تائید الٰہی سے مستحکم اور توفیق الٰہی کی بنا پر آسان تھا۔

یہ کلام ایسا ہے جس کی محبت اللہ نے دلوں میں ڈال دی اور اسے قبولِ عام عطا فرمایا، نیز اس کو ہیبت وحلاوت کا جامع بنایا اور الفاظ کی کم تعداد کے باوجود اپنا مفہوم بہترین انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت وویعت فرمائی۔ آپؐ کو اپنی گفتگو دہرانے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی اور نہ ہی سامع کو دوبارہ پوچھنے کی حاجت ہوتی۔

ان تمام اوصاف کے باوجود آپ کا ایک لفظ بھی اعلیٰ معیار سے کم تر نہیں اور نہ اس میں

کوئی لغوی لغزش ہے۔ نہ آپؐ کی کوئی دلیل و حجت بے اثر ہوئی اور نہ ہی آپؐ کا کوئی مخالف گفتگو میں آپؐ کے مقابل ٹھہر پایا اور نہ کوئی خطیب آپ کو لا جواب کر سکا، بلکہ آپ طویل خطبوں پر اپنے مختصر کلام کے ذریعے غالب وفائق رہے۔

آپؐ اپنے مخالف کو صرف انہی دلائل سے خاموش کرواتے جو آپؐ کے مدمقابل کے لئے معروف ہوتے اور آپ صرف سچ ہی کو بطور دلیل استعمال کرتے نیز صرف حق ہی کے ذریعے غلبہ وکامیابی کے طلب گار ہوتے۔ آپ نہ تو دغا وفریب پر مبنی کلام اختیار فرماتے اور نہ ہی طعن وتشنیع فرماتے۔ آپؐ نہ تو سست روی سے کلام فرماتے اور نہ ہی زیادہ تیزی سے، نہ لمبی گفتگو فرماتے نہ بہت مختصر۔

مزید برآں یہ کہ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے بڑھ کر نفع عام والا، سچے الفاظ پر مبنی، موزون ومعتدل، خوبصورت اسلوب اور عمدہ مفہوم ومطلب کا حامل، پُرتاثیر وبرمحل، مخرج کے لحاظ سے آسان تر، معنی ومفہوم کا بہترین ترجمان اور اپنے مطلب ومقصود میں واضح تر کلام کسی اور سے نہیں سنا۔

اس کلام نبوی کو ادبی اور دینی ہر دو لحاظ سے عرب معاشرے میں وہ پذیرائی اور اہمیت حاصل ہوئی کہ شاعری کو ایک قدم مزید پیچھے ہٹنا پڑا۔ اب عرب معاشرے کی ادبی ترجیح یوں قرار پائی کہ اول قرآن، دوم حدیث نبوی اور سوم شعر عرب۔ حتیٰ کہ پھر مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ مختلف وجوہات کی بناء پر نثر روز بروز زیادہ اہمیت اختیار کرتی چلی گئی، کیونکہ تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، تاریخ، جغرافیہ اور دیگر علوم وفنون کی تشکیل وتدوین نیز خطبات جمعہ وعیدین، سرکاری خط وکتابت اور فرامین وغیرہ کے لئے قدرتی طور پر نثر ہی اظہار وبیان کا آسان اور موزوں تر پیرایہ تھی۔ پس گزشتہ ڈیڑھ ہزار برس کی تاریخ میں مجموعی طور پر عربی نثر میں جو سرمایہ متنوع موضوعات پر مبنی لاکھوں کتب کی صورت میں تصنیف ومرتب کیا گیا، وہ شاعری کے مقابلے میں بیش از بیش ہے۔ چنانچہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آمد اسلام کے بعد بالآخر شاعری کا مقام قرآن وحدیث کے بعد

ٹھہرا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ علمی و دینی نیز دیگر ضروریات کی بناء پر شاعری کی تیسری حیثیت کو بھی نثر نے مسلمہ نہ رہنے دیا، بلکہ زیادہ سے زیادہ شاعری کے حق میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ احیائے علوم کے جس سلسلے کی ابتداء جاہلی شاعری سے ہوئی تھی، عہد بنو عباس (132-656ھ) کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے عربی نثر میں سینکڑوں علوم وفنون کی عظیم الشان تدوین نے اس کی تکمیل کردی اور قرآن وحدیث کے بعد خالصتاً ادبی نقطۂ نظر سے شعر ونثر ہر دو اپنی اپنی جگہ اہم قرار پائے۔

اس ساری بحث سے یہ بات بہر حال سامنے آتی ہے کہ آمد اسلام اور غلبۂ اسلام نے شاعری کی اہمیت اور حیثیت کو کافی متاثر کیا۔ یہ سلسلہ صرف یہیں تک محدود نہ رہا، بلکہ کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں نے شاعری کے بارے میں تنقیدی نقطۂ نظر اختیار کیا اور اس سلسلے میں کھل کر اظہار خیال فرمایا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر نہ ہونے کا یوں اعلان فرمایا: ''وما علمنه الشعر وماینبغی له''۔[14]

(ہم نے اُن کو شاعری کی تعلیم نہیں دی اور نہ وہ اُن کے لئے مناسب ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ذریعے اس بات کی تردید کی کہ قرآن کسی شاعر کا کلام ہے اور ساتھ ہی اس بات کا بھی اعلان کیا کہ شاعری ذات نبوی کے شایانِ شان نہیں، گویا کہ یہ اعلان کردیا کہ شاعری منصب نبوت ورسالت کی ذمہ داریوں سے مطابقت نہیں رکھتی کہ نبیؐ کو شاعری کی تعلیم دی جاتی، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر قرآن نے عربوں کے اس خیال باطل کی تردید کی کہ قرآن شاعری ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شاعر ہیں اور اس کے دلائل بھی مہیا کئے کہ شاعروں اور انبیاء علیہم السلام میں زمین وآسمان کا فرق ہے، نیز انبیاء اور شعراء کے پیروکاروں میں بھی وہی فرق نمایاں نظر آتا ہے۔ قرآن پاک میں قول ربانی ہے:

''والشعراء یتبعهم الغاؤن۔ ألم تر أنهم فی کل واد یهیمون۔
وأنهم یقولون مالا یفعلون۔ إلا الذین آمنوا وعملوا

الصلحت وذكروا اللّٰه كثيراً و انتصروا من بعد ما ظلموا
وسيعلم الذين ظلموا ایّ منقلب ینقلبون"۔[15]

ترجمہ: اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں، کیا آپؐ نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی (کلام) میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور وہ جو کچھ کہتے ہیں، اس پر عمل نہیں کرتے، سوائے ان کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہے، اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو انہوں نے بدلہ لیا، اور جن لوگوں نے ظلم کیا انہیں جلد ہی معلوم ہو جائیگا کہ انہیں پلٹ کر کہاں پہنچنا ہے۔

بنیادی طور پر قرآن کی یہی وہ آیت ہے جس سے شاعری کے اسلامی تصور پر کافی تفصیل سے روشنی پڑتی ہے۔علمائے تفسیر نے اس آیت کی روشنی میں جو تفصیلی اور جامع تشریحات کی ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شاعری کے بارے میں جو کچھ کتب حدیث میں مروی ہے، نیز صحابہ کرامؓ اور دیگر جلیل القدر مسلم شخصیات کا شاعری کے بارے میں جو طرزِ عمل رہا، اس کے نتیجے میں بڑی تفصیل کے ساتھ شاعری کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر جانا جا سکتا ہے اور اس افراط و تفریط سے بچا جا سکتا ہے، جس کے نتیجے میں شاعری کو بلا ضرورت محبوب یا بلا وجہ مذموم قرار دیا جاتا ہے۔

"ابن کثیرؒ سورۃ الشعراء کی ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقوله تعالى– (والشعراء يتبعهم الغاوون) قال علي بن أبي طلحة عن ابن عباس: يعني الكفار يتبعهم ضلال الانس والجن، وكذا قال مجاهد رحمه اللّٰه وعبدالرحمن بن زيد بن أسلم وغيرهما) وقال عكرمة: كان الشاعران يتهاجيان فينتصر لهذا فئام من الناس ولهذا فئام من الناس، فأنزل اللّٰه تعالىٰ (والشعراء يتبعهم الغاوون)"۔[16]

"وقوله تعالى (ألم تر أنهم في كل واد يهيمون) قال علي بن أبي طلحة عن ابن عباس: في كل لغو يخوضون، وقال الضحاك

عن ابن عباس: في كل فن من الكلام. وكذا قال مجاهد وغيره.
وقال الحسن البصري: قد والله رأينا أوديتهم التي يخوضون فيها، مرة في شتيمة فلان و مرة في مليحة فلان. وقال قتادة: الشاعر يمدح قوماً بباطل ويذمّ قوماً بباطل.

وقوله تعالىٰ (و أنهم يقولون مالا يفعلون) قال العوفي عن ابن عباس: كان رجلان على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم، أحدهما من الأنصار و الآخر من قوم آخرين و تهاجيا، فكان مع كل واحد منهما غواة من قومه وهم السفهاء، فقال الله تعالىٰ: (والشعراء يتبعهم الغاوون. ألم تر أنهم في كل واد يهيمون. و أنهم يقولون مالا يفعلون).

وقال علي بن ابي طلحة عن ابن عباس: أكثر قولهم يكذبون فيه. وهذا الذي قاله ابن عباس رضي الله عنه: هو الواقع في نفس الأمر، فإن الشعراء يتبجحون بأقوال أو أفعال لم تصدر منهم ولا عنهم، فيتكثرون بما ليس لهم، ولهذا اختلف العلماء رحمهم الله فيما إذا اعترف الشاعر في شعره بما يوجب حداً هل يقام عليه بهذا الاعتراف أم لا، لأنهم يقولون مالا يفعلون". [17]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ''اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں''۔
علی بن اُبی طلحہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ اس سے مراد کفار ہیں جن کی پیروی گمراہ جن وانس کرتے ہیں۔ یہی قول مجاہدؒ، عبدالرحمٰن بن زیدؒ وغیرہ سے منقول ہے اور عکرمہ فرماتے ہیں کہ دو شاعر ایک دوسرے کی ہجو گوئی کرتے تو

کچھ لوگ ایک کی طرف داری کرتے تو کچھ دوسرے کی حمایت کرتے۔ پس اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی ''والشعراء یتبعهم الغاوون''۔

اور اللہ کا فرمان، ''الم تر أنهم فی کل واد یهیمون'' کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی (کلام) میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

علی بن اَبی طلحہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ وہ ہر لغو بات میں جا پڑتے ہیں۔ اور ضحاکؒ نے ابن عباسؓ سے نقل کیا کہ: وہ ہر قسم کی گفتگو کرتے ہیں۔ یہی قول مجاہدؒ وغیرہ کا ہے اور حسن بصریؒ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی قسم ہم نے اُن کی وہ وادیاں دیکھی ہیں جن میں وہ جا پڑتے ہیں، کبھی کسی کو برا بھلا کہتے ہیں تو کبھی کسی کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ قتادہؒ نے کہا کہ شاعر کسی قوم کی ناحق مدح و تعریف کرتا ہے اور کسی اور کی ناحق ہجو و مذمت کرتا ہے۔

اور اللہ کا فرمان (ترجمہ: اور وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے)۔

عوفی نے ابن عباس سے نقل کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو آدمی تھے، ایک کا تعلق انصار سے جبکہ دوسرے کا کسی اور گروہ سے تھا، ان دونوں نے ایک دوسرے کی ہجو کی تو ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کی قوم کے گمراہ اور بے وقوف لوگ آ ملے، جس پر اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

اور علی بن ابی طلحہؒ نے ابن عباسؓ سے نقل کیا کہ یہ اپنی اکثر باتوں میں جھوٹ بولتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ فرمان حقیقت کے عین مطابق ہے، کیونکہ شعراء ایسے اقوال و افعال پر فخر کرتے ہیں جو ان سے صادر نہیں ہوتے اور ان اوصاف کا دعویٰ کرتے ہیں جو ان میں نہیں پائے جاتے۔ اسی لئے علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اگر شاعر اپنی شاعری میں کسی ایسے امر کا اعتراف کرے جس پر حد واجب ٹھہرتی ہو تو کیا اس اعتراف کی بنا پر اُس پر حد جاری کی جائے گی یا نہیں، اس

لئے کہ وہ ایسی باتوں کا دعویٰ کرتے ہیں جن پر عمل نہیں کرتے۔

آگے چل کر ابن کثیرؒ مزید لکھتے ہیں:

"(وقوله: إلا الذين آمنوا وعملوا الصالحات) قال محمد بن إسحق عن يزيد بن عبدالله بن قسيط عن أبي الحسن سالم البراد بن عبدالله مولى تميم الداري قال: لمّا نزلت (والشعراء يتبعهم الغاوون) جاء حسان بن ثابت و عبدالله بن رواحة وكعب بن مالك الى رسول الله صلى الله عليه وسلم وهم يبكون، قالوا: قد علم الله حين أنزل هذه الآية أنّا شعراء، فتلا النبي صلى الله عليه وسلم: (إلا الذين آمنوا وعملوا الصالحات) قال: "أنتم" (وذكروا الله كثيراً) قال: "أنتم" (وانتصروا من بعد ماظلموا) قال: "أنتم". رواه ابن أبي حاتم وابن جرير من رواية ابن اسحاق". (18)

ترجمہ: اور فرمانِ خدا "اِلا الّذين آمنوا وعملوا الصالحات..." کے سلسلہ میں محمد بن اسحاق نے یزید بن عبداللہ بن قسیط سے، انہوں نے اَبی الحسن سالم البراد بن عبداللہ مولیٰ تمیم الداری سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی "والشعراء يتبعهم الغاوون" تو حضرت حسانؓ بن ثابت، عبداللہؓ بن رواحہ اور کعبؓ بن مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس روتے ہوئے آئے اور کہنے لگے: اللہ تعالیٰ کو یہ آیت نازل کرتے وقت اس بات کا علم تھا کہ ہم شاعر ہیں۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مگر جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ اختیار کئے" سے مراد تم لوگ ہو اور "جنہوں نے اللہ کو بکثرت یاد کیا" تم ہو، نیز فرمایا کہ تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے اپنے اُوپر ظلم ہونے کے بعد اس کا بدلہ لیا۔

اس حدیث کو ابن ابی حاتم اور ابن جریرؒ نے ابن اسحاق سے روایت کیا۔

بعد از اں ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

''وقوله تعالٰی (وانتصروا من بعد ماظلموا) قال ابن عباس: یردّون علی الکفار الذین کانوا یھجون به المؤمنین. وکذا قال مجاھد وقتادة وغیر واحد. وھذا کما ثبت فی الصحیح أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال لحسان: ''اھجھم'' أو قال: ''ھاجھم وجبریل معک''. قال الامام أحمد: حدثنا عبدالرزاق حدثنا معمر عن الزھری عن عبدالرحمن بن کعب بن مالک عن أبیه أنه قال للنبی صلی اللّٰه علیه وسلم: إنّ اللّٰه عزوجل قد أنزل فی الشعراء ما أنزل، فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: ''إن المؤمن یجاھد بسیفه ولسانه والذی نفسی بیده لکأ نّما ترمونھم به نضح النبل''.[19]

ترجمہ: اور اللہ کا فرمان: ''وانتصروا من بعد ما ظلموا'' (اور انہوں نے اپنے اُوپر ظلم کئے جانے کے بعد بدلہ لیا) حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ وہ ان کفار کو جواب دیتے جو مؤمنین کی ہجو کوئی کرتے تھے۔ یہی قول مجاہد، قتادہ وغیرہ کا ہے اور ایسا ہی حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان سے فرمایا: ان کی ہجو کرو اور جبریل تمہارے ساتھ ہیں۔ امام احمد نے حضرت کعب بن مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اللہ نے شاعروں کے بارے میں جو کچھ نازل فرمانا تھا، فرمادیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک مومن اپنی تلوار اور زبان کے ساتھ جہاد کرتا ہے، قسم اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم اپنے اشعار کے ذریعے ان پر گویا کہ

تیروں کی بوچھاڑ کرتے ہو۔

مشہورتفسیر "معالم التنزیل" کے مصنف علامہ بغویؒ ان آیات کی تفسیر کے ضمن میں بیان کرتے ہیں:

"قولـه عـزوجـل (والشعـراء يتبعهم الغاوون) قـال أهل التفسير: أراد شعراء الكفار الذين كانوا يهجون رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، وذكر مقاتل أسماء هم فقال: ومنهم عبداللّٰه بن الزبعرىٰ السهمي وهبيرة بن أبي وهب المخزومي ومشافع بن عبد مناف وأبو عزة عمرو بن عبداللّٰه الجمحي وأمية بن أبي الصلت الثقفي، تكلموا بالكذب على رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم و بالباطل وقالوا نحن نقول مثل مايقول محمد وقالوا الشعر، واجتمع إليهم غواة من قومهم يستمعون أشعارهم حين يهجون النبي صلى اللّٰه عليه وسلم وأصحابه ويروون عنهم، وذلك قوله: (والشعراء يتبعهم الغاوون) هم الرواة الذين يروون هجاء النبي صلى اللّٰه عليه وسلم والمسلمين. وقال قتادة ومجاهد: الغاوون هم الشياطين. وقال الضحاك: تهاجى رجلان على عهد رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أحدهما من الأنصار والآخر من قوم آخرين، ومع كل واحد منهما غواة من قومه وهم السفهاء، فنزلت هذه الآية. وهي رواية عطية عن ابن عباس. (ألم تر أنهم في كل واد) من أودية الكلام (يهيمون) حائرون وعن طريق الحق جائرون،

والهائم الذاهب علی وجهه لامقصد له. قال ابن عباس رضی اللّٰه عنهما فی هذه الآية: فی کل لغو يخوضون. وقال مجاهد: فی کل فن يفتنون. وقال قتادة: يمدحون بالباطل ويستمعون ويهجون بالباطل، فالوادی مثل لفنون الکلام کما يقال: أنا فی واد وأنت فی واد. وقيل: فی کل واد يهيمون أی علٰی کل حرف من حروف الهجاء يصوغون القوافی. (وأنهم يقولون مالا يفعلون) أی يکذبون فی شعرهم، يقولون فعلنا وفعلنا وهم کذبة". [20]

ترجمہ: اللہ عزوجل کا فرمان (والشعراء يتبعهم الغاوون) کے سلسلہ میں اہل تفسیر کا قول ہے کہ اس سے مراد کفار کے شعراء ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتے تھے۔ مقاتل نے ان شعراء میں عبداللہ بن زبعری سہمی، ھبیرہ بن ابی وھب مخزومی، مشافع بن عبد مناف، ابوعزہ عمرو بن عبداللہ جمحی اور اُمیہ بن ابی صلت ثقفی کا نام بھی ذکر کیا ہے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں غلط اور جھوٹی باتیں کیں اور کہنے لگے کہ ہم بھی اُسی طرح کا کلام کہتے ہیں جیسا کہ محمدؐ کہتے ہیں اور انہوں نے شعر کہے اور جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی ہجو کرتے تو ان کی قوم کے گمراہ لوگ ان کے اشعار سننے اور انہیں روایت کرنے کے لئے جمع ہوجاتے۔ پس اللہ کے اس فرمان سے یہی روایت کرنے والے مراد ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی ہجو نقل وروایت کرتے تھے۔

قتادہ اور مجاہد کا قول ہے کہ گمراہ لوگ شیاطین ہیں اور ضحاک کا قول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو آدمیوں نے ایک دوسرے کی ہجو کی جن میں سے ایک کا تعلق انصار سے اور دوسرے کا کسی اور گروہ سے تھا اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ

اس کی قوم کے گمراہ و بے وقوف لوگ تھے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

یہ قول عطیہ نے ابن عباسؓ سے بھی روایت کیا ہے۔

''الم تر أنهم فی کل واد...'' کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں، یعنی ہر وادیٔ کلام میں (یهیمون) سرگرداں وحیراں ہیں اور وہ راہِ حق سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ حائم سے مراد وہ شخص ہے جو بلا مقصد آوارہ پھرتا رہے۔ ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ ہر بے ہودہ بات میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور مجاہد کا قول ہے کہ وہ قسم قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ قتادہ کا قول ہے کہ وہ جھوٹی تعریف کرتے ہیں، جھوٹ سنتے ہیں اور ناحق ہجو کہتے ہیں۔ پس وادی سے مراد کلام کی مختلف اصناف واقسام ہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ میں ایک وادی میں ہوں اور تم کسی اور وادی میں۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ وہ ہر وادی میں گھومتے پھرتے ہیں۔ یعنی ہجو گوئی کے تمام طریقوں پر اشعار نظم کرتے ہیں۔

''اور وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے'' یعنی اپنے اشعار میں جھوٹ بولتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے یوں کیا اور یوں کیا، جبکہ وہ جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں۔

آگے چل کر بغوی مزید لکھتے ہیں:

''ثم استثنٰی شعراء المسلمین الذین کانوا یجیبون شعراء الجاهلیة ویهجون الکفار وینافحون عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم وأصحابه، منهم حسّان بن ثابت وعبداللّٰه بن رواحة وکعب بن مالک، فقال: (إلا الذین آمنوا وعملوا الصالحات'')۔ (21)

ترجمہ: پھر اللہ نے مسلمان شعراء کو مستثنیٰ قرار دیا جو شعرائے جاہلیت کا جواب دیتے تھے اور کفار کی ہجو کرتے تھے نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کا دفاع کرتے تھے۔

ان شعراء میں سے حسانؓ بن ثابت، عبداللہؓ بن رواحہ اور کعبؓ بن مالک ہیں۔ پس اللہ نے ارشاد فرمایا ''مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے''۔

انہی آیات کی تفسیر کے ضمن میں علامہ بغوی نے احادیث بھی بیان کی ہیں، جن میں سے ایک اہم حدیث حضرت انسؓ کی روایت سے نقل کی ہے:

عن أنس أن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم دخل مكة في عمرة القضاء وابن رواحة يمشي بين يديه ويقول:

خلّوا بني الكفار عن سبيله　　اليوم نضربكم على تنزيله

ضرباً يزيل الهام عن مقيله　　ويذهل الخليل عن خليله

فقال له عمر: يا ابن رواحة، بين يدي رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وفي حرم اللّٰه تقول الشعر؟ فقال النبي صلى اللّٰه عليه وسلم: ''خلّ عنه يا عمر، فلهي أسرع فيهم من نضح النبل''.[22]

ترجمہ: انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے اس حال میں کہ عبداللہؓ بن رواحہ آپ کے آگے آگے چلتے ہوئے کہہ رہے تھے:
اے کافروں کی اولاد آپ کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ آج ہم تمہیں اس کلام کے نازل ہونے پر تلواروں سے ایسی ضرب لگا رہے ہیں جو کہ کھوپڑیوں کو اُن کی جگہ سے ہٹا دیتی ہے اور دوست کو دوست سے بے خبر کر دیتی ہے۔

پس عمرؓ ان سے کہنے لگے: اے ابن رواحہ تم اللہ کے حرم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شعر کہہ رہے ہو؟ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر ان کو کچھ نہ کہو کیونکہ یہ (اشعار) ان (کفار) کے سینوں میں تیروں کی بوچھاڑ سے بھی زیادہ اثر کرتے ہیں۔

بعد ازاں ''وذكروا اللّٰه كثيراً'' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''(وذكروا اللّٰه كثيراً) أى لم يشغلهم الشعر عن ذكر اللّٰه''.

''(وانتصروا من بعد ماظلموا) قال مقاتل: انتصروا من المشركين لأنهم بدأوا بالهجاء''۔ [23]

ترجمہ: (اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہے) یعنی شاعری نے انہیں اللہ کی یاد سے غافل نہیں کیا۔ (اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو اُنہوں نے بدلہ لیا) مقاتل کا قول ہے کہ انہوں نے مشرکین سے بدلہ لیا کیونکہ ہجو کا آغاز اُنہوں نے ہی کیا تھا۔

جلال الدین محلّی اور جلال الدین سیوطی اپنی مشترکہ ''تفسیر الجلالین'' میں ان آیات کی مختصر مگر جامع تشریح یوں کرتے ہیں:

''(والشعراء يتبعهم الغاوون) في شعرهم، فيقولون به ويروونه عنهم، فهم مذمومون۔ (ألم تر) تعلم (أنهم في كل واد) من أودية الكلام وفنونه (يهيمون) يمضون فيجاوزون الحد مدحاً وهجاء۔

(وأنهم يقولون) فعلنا مالا يفعلون (يكذبون)۔

(إلا الذين آمنوا وعملوا الصالحات) من الشعراء۔

(وذكروااللّٰه كثيراً) لم يشغلهم الشعر عن الذكر۔

(وانتصروا) بهجوهم الكفار (من بعد ماظلموا) بهجوالكفار في جملة المؤمنين، فليسوا مذمومين، قال اللّٰه تعالىٰ: ''لايحب اللّٰه الجهر بالسوء من القول إلا من ظلم''، وقال تعالىٰ: ''فمن اعتدى عليكم فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدى عليكم''۔ وسيعلم الذين ظلموا) من الشعراء وغيرهم۔ (أىّ منقلب) مرجع (ينقلبون) يرجعون بعدالموت''۔ [24]

ترجمہ: (اورشاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں) ان کی شاعری میں پیروی کرتے ہیں۔ وہ ان اشعار کو پڑھتے اورروایت کرتے ہیں،لہذا وہ قابل مذمت ہیں۔

الم تر (کیا آپ نے نہیں دیکھا) یعنی آپ نے نہیں جانا (کہ وہ ہر وادی میں) کلام کی وادیوں اور اصناف کلام میں (بھٹکتے پھرتے ہیں) وہ ان میں سے گزرتے ہیں اور مدح وہجاء میں حد سے تجاوز کرتے ہیں (اور وہ کہتے ہیں) ہم نے یوں کیا (جو وہ نہیں کرتے) یعنی جھوٹ بولتے ہیں (سوائے ان کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے) شعراء میں سے (اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہے) انہیں شاعری نے اللہ کی یاد سے غافل نہیں کیا (اور انہوں نے بدلہ لیا) کفار کی ہجو کرکے (ان پر ظلم کئے جانے کے بعد) کفار کی جانب سے تمام اہل ایمان کی ہجو کے ذریعے، پس یہ لوگ قابل مذمت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے (اللہ کو کسی کی بری بات کا ظاہر کرنا پسند نہیں مگر جس پر ظلم ہوا)۔ اور اللہ نے ارشاد فرمایا (پس جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اسی کی زیادتی کے برابر اس پر زیادتی کرلو)۔

(اور جن لوگوں نے ظلم کیا انہیں جلد ہی معلوم ہوجائے گا) شاعروں اور ان کے علاوہ دیگر لوگوں میں سے (کون سی پلٹنے کی جگہ) واپسی کی جگہ (وہ پلٹیں گے) یعنی موت کے بعد واپس آئیں گے۔

مشہور مفسر علامہ زمخشری اپنی تفسیر "الکشاف" میں ان آیات کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

"(والشعراء) مبتدأ و (يتبعهم الغاوون) خبره، ومعناه أنه لا يتبعهم على باطلهم وكذبهم وفضولهم وما هم عليه من الهجاء وتمزيق الأعراض والقدح في الأنساب والنسيب بالحرم والغزل والابتهار ومدح من لايستحق المدح ولا

يستحسن ذلک منهم ولا يطرب على قولهم إلا الغاوون والسفهاء الشطار. وقيل: الغاوون الراوون وقيل الشياطين. وقيل: هم شعراء قريش، عبدالله بن زبعرى وهبيرة بن أبي وهب المخزومي ومسافع بن عبد مناف و أبو عزة الجمحي، ومن ثقيف أمية بن أبي الصلت، قالوا: نحن نقول مثل قول محمد، وكانوا يهجونه، ويجتمع إليهم الأعراب من قومهم يستمعون أشعارهم وأهاجيهم''.(25)

ترجمہ: "والشعراء" مبتدا ہے اور "يتبعهم الغاوون" اس کی خبر ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ان شاعروں کے کذب وباطل، فضولیات، ہجوگوئی، عزتوں کو پامال کرنے، نسب میں طعن وتشنیع، عورتوں کے متعلق ممنوعہ شعر وشاعری اور غزل گوئی نیز فخر وتکبر اور غیر مستحق کی مدح سرائی جیسے معاملات کو صرف گمراہ، احمق اور خبیث لوگ ہی اچھا سمجھتے ہیں اور ان کی ایسی باتوں پر خوش ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ گمراہ لوگوں سے مراد شاعری کی روایت کرنے والے ہیں نیز یہ بھی کہا گیا کہ اس سے شیاطین مراد ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے قریش کے شعراء مراد ہیں یعنی عبداللہ بن زبعری، ھبیرہ بن ابی وھب مخزومی، مسافع بن عبد مناف، ابوعزہ جمحی اور قبیلہ ثقیف سے امیہ بن ابی صلت۔

یہ کہتے تھے کہ ہم بھی محمدؐ جیسا کلام کہتے ہیں نیز وہ آپؐ کی ہجو کرتے تھے اور ان کی شان میں گستاخی کرتے تھے اور اُن کی قوم کے ناسمجھ لوگ اُن کے اشعار اور ہجو سننے کے لئے جمع ہوتے تھے۔

زمخشری مزید لکھتے ہیں:

''ذكر الوادي والهيوم، فيه تمثيل لذهابهم في كل شعب من القول واعتسافهم وقلة مبالاتهم بالغلو في المنطق ومجاوزة

حـد الـقـصـد فيـه حتـى يـفـضـلـوا أجبـن الناس على عنترة و أشحهم على حاتم، و أن يبهتوا البرى ويفسقوا التقى". [26]

ترجمہ: وادی اور بھٹکنے کا ذکر کر کے مثال بیان کی گئی ہے کہ وہ ہر وادئ کلام میں اُتر تے ہیں نیز اس میں ان کی بے راہ روی اور کلام میں مبالغہ آرائی اور حد اعتدال سے تجاوز کا ذکر ہے، حتیٰ کہ وہ اپنے کلام میں بزدل ترین شخص کو عنترہ پر، بخیل ترین شخص کو حاتم طائی پر فوقیت دے دیتے ہیں، بے گناہ پر الزام تراشی کرتے ہیں اور صالح پرہیز گار کو فاسق و فاجر بناڈالتے ہیں۔

''إلا الذين آمنوا الخ– ينقلبون''.

''استثنـى الشعـراء الـمـومـنيـن الـصـالحين الذين يكثرون ذكـر الـلّٰه و تلاوة الـقـرآن، و كـان ذلـك أغـلـب عليهم من الشعـر، وإذا قـالـوا شـعـراً قالوه فى توحيد اللّٰه و الثناء عليه والـحـكـمة والـمـوعـظة والـزهـد والآداب الحسنة ومدح رسـول الـلّٰـه صلى اللّٰه عليه وسلم والصحابة وصلحاء الأمة ومـالا بـأس بـه مـن الـمعانى التى لايتلطخون فيها بذنب ولا يتـلبسـون بشـائـنة ولا مـنقصة، وكان هجاؤهم على سبيل الانتصار ممن يهجوهم''. [27]

ترجمہ: ایسے نیک مومن شعراء کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جو بکثرت اللہ کا ذکر اور تلاوت قرآن کرنے والے ہیں اور شاعری کی نسبت ان کا یہ وصف زیادہ نمایاں و غالب ہے اور جب وہ شعر کہتے ہیں تو اللہ کی توحید وثناء، حکمت وموعظت، زہد وآداب حسنہ نیز مدح رسولؐ وصحابہؓ وصالحین اُمت اور دیگر ایسے موضوعات ومفاہیم میں شعر کہتے ہیں، جن میں کوئی حرج نہیں۔ وہ ان مفاہیم ومعانی میں نہ تو غلطیات کی آمیزش کرتے ہیں اور نہ ہی کسی معیوب اور نقصان دہ چیز کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کی ہجو کوئی ہجو کرنے

والوں سے بدلہ لینے کے لئے ہوتی ہے۔

علامہ ناصر الدین بیضاویؒ جو معتزلی الفکر علامہ زمخشریؒ کے برعکس "اهل السنة والجماعة" کے ترجمان ہیں، اپنی مشہور زمانہ تفسیر "أنوار التنزيل و أسرار التاويل" میں زمخشریؒ ہی کے اسلوب میں ان آیات کی تفسیر یوں کرتے ہیں:

"(والشعراء يتبعهم الغاوون) واتباع محمد ليسوا كذلك، وهو استئناف أبطل كونه عليه الصلاة والسلام شاعراً، وقرره بقوله (ألم تر أنهم في كل واد يهيمون) لأن أكثر مقدماتهم خيالات لاحقيقة لها و أغلب كلماتهم في النسيب بالحرم والغزل والابتهار وتمزيق الاعراض والقدح في الأنساب والوعد الكاذب والافتخار الباطل ومدح من لايستحقه والاطراء فيه وإليه أشار بقوله: (وأنهم يقولون مالا يفعلون) وكأنه لمّا كان اعجاز القرآن من جهة اللفظ والمعنى وقدحوا في المعنى بأنه مما تنزّلت به الشياطين، وفي اللفظ بأنه من جنس كلام الشعراء تكلّم في القسمين وبين منافسة القرآن لهما، وما مضادة حال الرسول صلى الله عليه وسلم لحال أربابهما". (28)

ترجمہ: (اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں) جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ایسے نہیں ہیں۔ یہ نیا جملہ شروع ہو رہا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر ہونے کی نفی ہے اور اس کی مزید تاکید اس آیت سے ہو رہی ہے (کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں) کیونکہ ان کے اکثر موضوعاتِ شعر غیر حقیقی خیالات کا مجموعہ ہوتے ہیں نیز اُن کا اکثر وبیشتر کلام عورتوں کے بارے میں

غلط بیانی، غزل، بہتان، عزتوں کی پامالی، نسب میں طعن، جھوٹے وعدوں، ناحق فخر و تکبر، نا اہل کی مدح سرائی اور اس میں مبالغہ آرائی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی کی طرف اللہ نے یہ کہہ کر اشارہ فرمایا (اور وہ جو کچھ کہتے ہیں، اُس پر عمل نہیں کرتے)۔

چونکہ قرآن لفظی ومعنوی دونوں اعتبار سے معجزہ ہے اور مشرکین نے اس کے معنی و مفہوم پر یہ اعتراض کیا کہ اس کا تعلق اُن معاملات سے ہے جنہیں شیاطین لے کر اُترتے ہیں نیز لفظی حوالے سے قرآن پر یہ اعتراض کیا کہ یہ شاعروں کے کلام کی جنس سے تعلق رکھتا ہے، تو اللہ نے دونوں قسموں کے بارے میں ارشاد فرمایا اور قرآن سے ان دونوں کا مقابلہ واضح فرمایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کا شعراء وشیاطین کے احوال سے مختلف ومتصادم ہونا بیان فرمایا۔

پھر اگلی آیت کی شرح میں لکھتے ہیں:

''(إلا الذين آمنوا وعملوا الصالحات وذكروا الله كثيراً وانتصروا من بعد ما ظلموا) استثناء للشعراء المؤمنين الصالحين الذين يكثرون ذكر الله ويكون أكثر أشعارهم في التوحيد والثناء على الله تعالى والحث على طاعته، ولو قالوا هجواً أرادوا به الانتصار ممن هجاهم ومكافحة هجاة المسلمين كعبدالله بن رواحة وحسّان بن ثابت والكعبين. وكان عليه الصلاة والسلام يقول لحسان: "قل وروح القدس معک''. وعن کعب بن مالک أنه عليه الصلاة والسلام قال له: "أهجهم فوالذي نفسي بيده لهو أشد عليهم من النبل''.(29)

ترجمہ: (سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے

رہے اور جب اُن پر ظلم کیا گیا تو انہوں نے بدلہ لیا)۔

مومن صالح شعراء کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جو کہ اللہ کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں اور اُن کے اکثر اشعار توحید، اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور اُس کی اطاعت کی ترغیب پر مشتمل ہوتے ہیں اور اگر وہ ہجو یہ شاعری کرتے ہیں تو اُن کا مقصود اپنی ہجو کرنے والوں سے بدلہ لینا اور مسلمانوں کی ہجو گوئی کرنے والوں کا مقابلہ ہوتا ہے جس طرح کہ عبداللہؓ بن رواحہ، حسانؓ بن ثابت، کعبؓ بن مالک اور کعبؓ بن زہیر ہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام حسانؓ سے فرمایا کرتے تھے: شعر کہو اور جبریلؑ تمہارے ساتھ ہیں۔ نیز کعبؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن سے فرمایا: اِن (مشرکین) کی ہجو کرو قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ اشعار اُن پر تیروں کی بوچھاڑ سے زیادہ اثر کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا اہم قدیم تفاسیر میں سورۃ الشعراء کی متعلقہ آیات کے ضمن میں جو اقوال اور آراء مفسرین نے درج کی ہیں، کم وبیش ایسی ہی تشریح دوسری اہم کتب تفسیر میں ہے، نیز دورِ جدید کی اہم تفاسیر میں بھی قدیم تفاسیر کے مباحث سے استفادہ اور ان سے بالعموم اتفاق کیا گیا ہے۔[30]

سورۃ الشعراء کی ان آیات کی تفسیر کے ضمن میں ان احادیث کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے، جو شاعری کے بارے میں مستند کتب احادیث میں درج ہیں اور جن میں سے کئی ایک کو قدیم کتب تفسیر میں روایت کیا گیا ہے۔ اس کے بعد شاعری کے اسلامی تصور کے بارے میں تفصیلی اور واضح رائے آسانی سے قائم کی جاسکتی ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ دفاع ذات نبوی اور دیگر دینی ضروریات کے تحت شاعری جس سے اسلام کو تقویت ملے اور دشمنان اسلام کے حوصلے پست ہوں، نہ صرف جائز ہے بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود ہجو کفار کے توڑ کے لئے حضرت حسانؓ بن ثابت اور دیگر حضرات کو مامور کیا۔ اس سلسلے میں کتب احادیث میں کئی روایات درج ہیں۔ ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں جن سے

شاعری کی اس صنف برائے دفاعِ دین کی اہمیت واضح ہوتی ہے:

1- ''عن عائشه رضى الله عنها قالت استاذن حسان بن ثابت رسول الله صلى الله عليه وسلم في هجاء المشركين، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: فكيف بنسبي، فقال حسان: لأسلنّک منهم كما تسلّ الشعرة من العجين''.(31)

ترجمہ: عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حسان بن ثابت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین (قریش) کی ہجو کرنے کی اجازت طلب کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کس طرح ہوگا، جبکہ میں بھی اُن کا ہم نسب ہوں؟ تو حسان نے فرمایا: میں آپ کو اُن میں سے اِس طرح نکال لوں گا جس طرح گندھے ہوئے آٹے میں سے بال نکال لیا جاتا ہے۔

2- ''عن ابى سلمة بن عبدالرحمن بن عوف انه سمع حسان بن ثابت الأنصارى يستشهد ابا هريرة فيقول: يا أباهريرة، نشدتک بالله هل سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: يا حسّان أجب عن رسول الله، اللّهم أيّده بروح القدس؟ قال أبو هريرة: نعم''.(32)

ترجمہ: ابوسلمہ بن عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے روایت ہے کہ انہوں نے حسانؓ بن ثابت انصاری کو ابو ہریرہؓ سے گواہی طلب کرتے ہوئے سنا، پس وہ فرماتے ہیں: اے ابوہریرہ، میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ: اے حسان اللہ کے رسولؐ کی جانب سے (ہجو کفار کا) جواب دو یا اللہ اس کی روح القدس (جبرئیل) کے ذریعے مدد فرما، ابوہریرہؓ نے جواب دیا: ہاں۔ (بروایت صحیح بخاری)

3- عن البراء رضي الله عنه أنّ النبي صلى الله عليه وسلم قال لحسان: أهجهم، أو قال: هاجهم وجبريل معک.(33)

ترجمہ: براءؓ(بن عازب) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حسانؓ (بن ثابت) سے فرمایا: ان (مشرکین) کی ہجو کرو، یا یوں فرمایا: ان کی ہجو کرو اور جبریلؑ تمہارے ساتھ ہے۔

4- حدثنا أصبغ قال، أخبرني عبدالله بن وهب، قال أخبرني يونس عن ابن شهاب أن الهيثم بن أبي سنان أخبره أنه سمع أبا هريرة في قصصه يذكر النبي صلى الله عليه وسلم يقول، إن أخاً لكم لايقول الرفث يعني بذاک ابن رواحة قال:

فينا رسول الله يتلو كتابه
اذا انشق معروف من الفجر ساطع
أرانا الهدى بعد العمى فقلوبنا
به موقنات أن ما قال واقع
يبيت يجافي جنبه عن فراشه
إذا استثقلت بالكافرين المضاجع(34)

ترجمہ: ہم سے اصبغ نے بیان کیا کہ مجھے عبداللہ بن وہب نے خبر دی کہ مجھے یونس نے ابن شہاب (زہری) سے روایت کرتے بتایا کہ انہیں ہیثم بن ابی سنان نے خبر دی کہ انہوں نے ابو ہریرہؓ کو اپنے بیان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرماتے ہوئے سنا: یقیناً تمہارا ایک بھائی غلط بات نہیں کہتا، یعنی (عبداللہ) ابن رواحہؓ جنہوں نے یہ شعر کہے:

ہمارے درمیان اللہ کا رسولؐ ہے جو اس کی کتاب کی تلاوت فرماتا ہے۔
جب حق ظاہر ہوجائے تو وہ فجر کے اُجالے سے بھی زیادہ روشن ہوتا ہے۔

اُنہوں نے ہمیں گمراہی کے بعد راہِ ہدایت دکھلائی،
پس ہمارے دلوں کو یقین ہے کہ جو آپ نے فرمایا، وہ ہو کر رہے گا۔
آپؐ رات اِس حال میں گزارتے ہیں کہ آپ کا پہلو بستر سے جدا رہتا ہے،
اُس وقت جبکہ کافروں کے بستر اُن کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں۔
مشکوۃ المصابیح میں اس سلسلے میں درج ذیل روایات ہیں:

-1 عن عائشة قالت كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يضع لحسان منبراً في المسجد يقوم عليه قائماً يفاخر عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أوينافح ويقول رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: إن اللّٰه يؤيد حسّان بروح القدس ما نافح أو فاخر عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم. (رواه البخاري). [35]

ترجمہ: عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسانؓ کے لئے مسجد (نبوی) میں منبر رکھواتے، جس پر کھڑے ہوکر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے فخریہ شاعری میں مقابلہ کرتے یا آپؐ کا دفاع کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: یقیناً اللہ روح القدس (جبریلؑ) کے ذریعے حسانؓ کی مدد فرماتا ہے، جب تک وہ شعروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مفاخرت یا مدافعت کرتے رہتے ہیں۔

-2 عن كعب بن مالك أنه قال للنبي صلى اللّٰه عليه وسلم، إن اللّٰه تعالىٰ قد أنزل في الشعر ما أنزل، فقال النبي صلى اللّٰه عليه وسلم: إن المؤمن يجاهد بسيفه ولسانه والذي نفسي بيده لكأنما ترمونهم به نضح النبل (رواه في شرح السنة). [36]

ترجمہ: کعبؓ بن مالک سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے شاعری کے بارے میں جو نازل کرنا تھا، کردیا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک مؤمن اپنی تلوار اور زبان کے ذریعے جہاد کرتا ہے، اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم اپنی شاعری (ہجو کفار) کے ذریعے گویا اُن پر تیروں کی بوچھاڑ کررہے ہو۔

دینی ضروریات کے تحت ہجو کفار اور دفاعِ اسلام وذاتِ نبوی کی خاطر شاعری کو روا رکھنے کے علاوہ بھی نبی علیہ السلام نے شعر کے بارے میں حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کیا اور خود کئی مواقع پر اچھی اور پاکیزہ شاعری میں دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ شعر کے سلسلے میں آپ کے جو اقوال کتب احادیث میں ملتے ہیں، ان سے شاعری کے بارے میں اسلام کا یہ نکتۂ نظر بڑی وضاحت سے سامنے آجاتا ہے کہ شاعری ایک صنف کلام ہے جس میں برا بھلا رطب ویابس سب کچھ ہے، قابل اعتراض بعض مضامین شعر ہیں، شاعری بذاتِ خود مذموم نہیں۔ اس کی تائید درج ذیل اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتی ہے:

1- **إن من الشعر حكمة.**[37]

ترجمہ: یقیناً شاعری میں حکمت بھری باتیں بھی ہیں۔

2- **عن صخر بن عبداللّٰه بن بريدة عن أبيه عن جده قال سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول:**
إن من البيان سحراً و إن من العلم جهلًا و إن من الشعر حكما و إن من القول عيالًا (رواه ابو داؤد).[38]

ترجمہ: صخر بن عبداللہ بن بریدہ نے اپنے والد سے اپنے دادا کے توسط سے روایت کیا کہ انہوں (بریدہؓ) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: یقیناً بعض بیان جادو اثر ہوتے ہیں اور بعض علم جاہلانہ ہیں، نیز شاعری میں حکمت بھری باتیں بھی ہیں اور بعض قول گراں گزرتے ہیں۔

3- عـن عـائشة قالت ذكر عند رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم الشعر فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم:
هو كلام فحسنه حسن و قبيحه قبيح (رواه الدار قطني).[39]

ترجمہ: عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شاعری کا ذکر کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
وہ ایک صنف کلام ہے، جس کا اچھا حصہ اچھا ہے اور برا حصہ برا ہے۔

4- عن أبي هريرة قـال قـال رسـول الـلّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم:
أصدق كلمة قالها الشاعر كلمة لبيد
ألا كل شيء ما خلا اللّٰه باطل (متفق عليه).[40]

ترجمہ: ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے سچی بات جو کسی شاعر نے کہی ہے، وہ لبید (بن ربیعہ) کا یہ شعر ہے:
دیکھو، اللہ کے سوا ہر چیز ختم ہو جانے والی ہے۔

مذکورہ احادیث کے علاوہ دیگر احادیث کے مطالعے سے شاعری کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے متعلق مزید معلومات بھی ملتی ہیں۔

1- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ شاعر نہ تھے، مگر آپ کی فصیح و بلیغ زبان سے کئی ایسے کلمات صادر ہوتے تھے جو اوزانِ شعر کے معیاروں پر بھی پورے اترتے، مثلاً صحیح بخاریؒ کی روایت ہے:

"حـدثـنا أبو نعيم حدثنا سفيان عن الأسود بن قيس، سمعت جـنـدباً يـقـول بيـنـما النبي صلى اللّٰه عليه وسلم يمشي اذا أصابه حجر فعثر فدميت إصبعه فقال:
هل أنت إلا إصبع دميت وفي سبيل اللّٰه مالقيت".[41]

ترجمہ: ہمیں ابونعیم نے بتلایا کہ ہم سے سفیان نے اسود بن قیس سے روایت کر کے بیان کیا کہ میں نے جندبؓ کو فرماتے سنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب پیدل چل رہے تھے تو اُنہیں ایک پتھر لگا جس سے اُن کی اُنگلی زخمی ہوگئی تو آپؐ نے فرمایا: تو ایک اُنگلی ہی تو ہے جو خون آلود ہوگئی ہے اور جو کچھ تیرے ساتھ ہوا ہے وہ اللہ کی راہ میں ہوا ہے۔

یہی روایت مشکوۃ المصابیح میں یوں درج ہے:

''وعن جندب أن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان فی بعض المشاھد وقد دمیت إصبعه فقال:

هل أنت إلا اصبع دمیت وفی سبیل اللّٰہ مالقیت

(متفق علیه)''[42]

ترجمہ: جندبؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ میں تھے اور اُن کی اُنگلی زخمی ہوگئی تھی، تو آپ نے فرمایا: تو ایک اُنگلی ہی تو ہے جو خون آلود ہوگئی ہے اور تیرے ساتھ جو ہوا، وہ اللہ کی راہ میں ہوا ہے۔

اس سلسلے میں مشکوٰۃ المصابیح کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ خندق کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کھودتے اور مٹی ڈھوتے ہوئے ایسے کلمات ارشاد فرمائے جو اوزانِ شعر پر بھی پورے اُترتے ہیں:

''وعن أنس قال، جعل المهاجرون والأنصار یحفرون الخندق وینقلون التراب وهم یقولون:

نحن الذین بایعوا محمدا علی الجهاد ما بقینا أبدا

یقول النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم وهو یجیبهم:

اللّٰهم لا عیش إلا عیش الآخرة فاغفر الأنصار والمهاجرة''

(متفق علیه)[43]

ترجمہ: انسؓ سے روایت ہے کہ مہاجرین و انصار خندق کھودنے اور مٹی منتقل کرنے لگے، اس حال میں کہ وہ کہہ رہے تھے: ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمدؐ کی بیعت کی، اس بات پر کہ: ہم جب تک زندہ و باقی ہیں، ہمیشہ جہاد کرتے رہیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے جواب میں فرماتے تھے:

یا اللہ، زندگی تو در حقیقت آخرت ہی کی زندگی ہے۔ پس تو انصار و مہاجرین کی مغفرت فرما۔

نیز احادیث سے اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شعر کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور اچھے اشعار کا پڑھنا اور سننا پسند فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں چند احادیث درج ذیل ہیں:

-1 ''وعن البراء قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينقل التراب يوم الخندق حتى اغبر بطنه يقول:

والله لولا الله ما اهتدينا ولا تصدّقنا ولا صلّينا

فانزلن سكينة علينا وثبّت الأقدام إن لاقينا

إن الأولى قد بغوا علينا إذا أرادوا فتنة أبينا

يرفع بها صوته، أبينا أبينا. (متفق عليه)''. (44)

ترجمہ: براءؓ (بن عازب) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خندق کے موقع پر مٹی منتقل کر رہے تھے، یہاں تک کہ اُن کا بطن غبار آلود ہوگیا، آپ فرما رہے تھے:

بخدا اگر اللہ کی ذات نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہ پاتے اور نہ صدقہ دیتے، نہ نماز پڑھتے،

پس ہم پر سکینت نازل فرما اور اگر ہمارا (کفار سے) آمنا سامنا ہو تو ہمیں ثابت قدم رکھ

بیشک اُنہوں نے ہمارے خلاف سرکشی دکھائی ہے، جب اُنہوں نے فتنہ کا ارادہ کیا تو ہم اُن کے سامنے ڈٹ گئے۔

وہ با آوازِ بلند کہتے جاتے تھے: اَبَینَا اَبَینَا (ہم نے انکار کیا، انکار کیا)۔

-2 ''عن سلمة بن الأكوع قال: خرجنا مع رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم إلى خيبر، فسرنا ليلًا، فقال رجل من القوم لعامر بن الأكوع: ألا تسمعنا من هنيهاتک، قال وكان عامر رجلًا شاعراً، فنزل يحدلو بالقوم يقول:

اللّٰهم لولا أنت ما اهتدينا ولا تصدّقنا ولا صلّينا
فاغفر فداء لک ما اقتفينا وثبّت الأقدام إن لاقينا
وألقين سكينة علينا إنّا إذا صيح بنا أتينا
وبالصياح عولوا علينا

فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: من هذا السائق؟ قالوا: عامر بن الأكوع، فقال: يرحمه اللّٰه''.(45)

ترجمہ: سلمٰی بن اکوع سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمراہ خیبر کی طرف نکلے، پس ہم رات کو چلتے رہے، تو لوگوں میں سے ایک شخص نے عامر بن اکوع سے کہا: کیا تم ہمیں اپنے حدی کے اشعار نہیں سناؤ گے؟ انہوں نے بیان کیا کہ عامر شاعر تھے، پس وہ نیچے اُترے اور حدی خوانی کرتے ہوئے کہنے لگے:

یا اللہ اگر تیری ذات نہ ہوتی، تو ہم ہدایت نہ پاتے اور نہ ہی صدقہ دیتے، نہ نماز پڑھتے،
ہم تجھ پر قربان، پس جب تک ہم پیروی کرتے رہیں، ہماری مغفرت فرما۔
اور ہم پر سکینت نازل فرما، کیونکہ جب ہمیں پکارا جائے، ہم حاضر ہوجاتے ہیں۔
اس حال میں کہ لوگ چلا چلا کر ہم سے مدد مانگتے ہیں۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ حدی خوان کون ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: عامر بن اکوع۔ آپ نے فرمایا: اللہ اس پر رحمت فرمائے۔

-3 عن عمرو بن الشريد عن أبيه قال: ردفت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه

وسلم يوماً فقال: هل معک من شعر أمية بن أبي الصلت شئي؟ قلت نعم، قال: هيه، فانشد ته بيتاً، فقال: هيه، ثم أنشدته بيتاً، فقال: هيه، حتى أنشدته مائة بيت''۔ (46)

ترجمہ: عمرو بن شرید اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھا، تو آپ نے فرمایا: کیا تجھے اُمیہ بن ابی صلت کے کچھ شعر یاد ہیں؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں، آپ نے فرمایا: سناؤ، پس میں نے آپ کو ایک شعر سنایا، تو آپؐ نے فرمایا: اور سناؤ۔ میں نے آپؐ کو پھر ایک شعر سنایا، تو آپ نے فرمایا: اور سناؤ، یہاں تک کہ میں نے آپ کو ایک سو شعر سنائے۔

آخری حدیث سے نہ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ ادبی ذوق اور شعر سے دلچسپی کا پتہ چلتا ہے، بلکہ ایک غیر مسلم شاعر کے بیک وقت سو عمدہ اشعار باصرار سننے سے معلوم ہوتا ہے کہ مثبت شاعری خواہ غیر مسلم کی ہو، اسے بھی خوش آمدید کہنا اور اس سے استفادہ کرنا ممنوع نہیں۔

ان احادیث کے علاوہ مستند کتب حدیث میں وہ مشہور حدیث بھی ہے، جس میں شاعری کی شدید مذمت ہے اور اس سے تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنے کے سلسلے میں واضح رہنمائی ملتی ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاریؒ و مسلمؒ جیسی مستند کتب حدیث میں موجود ہے۔

-1 ''عن ابن عمر رضي الله عنهما عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لأن يمتلئي جوف أحدكم قيحاً خيرله من أن يمتلئي شعراً''۔ (47)

ترجمہ: (عبداللہ) ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کسی کا پیٹ، پیپ سے بھر جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ شاعری سے بھرے۔

2- عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لأن يمتلئ جوف رجل قيحاً يريه خير من أن يمتلئ شعراً". (48)

ترجمہ: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کسی ایک شخص کا پیٹ، پیپ سے بھر جائے اور اُسے گلا دے، تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ شاعری سے بھرے۔

3- "عن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لأن يمتلئ جوف الرجل قيحاً يريه خير من أن يمتلئ شعراً". (49)

ترجمہ: ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کسی فرد کا پیٹ، پیپ سے بھر کر اُسے گلا دے، تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ شاعری سے بھرے۔

4- "عن أبي سعيدالخدري قال: بينا نحن نسير مع رسول الله صلى الله عليه وسلم بالعرج إذ عرض شاعر ينشد، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: خذوا الشيطان، أو أمسكوا الشيطان، لأن يمتلئ جوف رجل قيحاً خير له من أن يمتلئ شعراً". (50)

ترجمہ: ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے: کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ عرج کے مقام پر سفر کر رہے تھے کہ ایک شاعر شعر پڑھتے ہوئے سامنے آیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیطان کو پکڑ لو، (یا فرمایا) شیطان کو روک لو۔ کسی شخص کا پیٹ، پیپ سے بھر جائے تو یہ اس

سے بہتر ہے کہ یہ شاعری سے بھرے۔

اس آخری حدیث کی تشریح میں جس میں مذکورہ بالا، احادیث بھی سما جاتی ہیں، مشہور محدث امام نوویؒ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بڑی تفصیل سے تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کر کے شاعری کے بارے میں اسلامی حدود و قیود کی نشاندہی کرتا ہے:

''قال أبو عبيد والعلماء كافة: الصواب أن المراد أن يكون الشعر غالباً عليه مستولياً عليه بحيث يشغله عن القرآن وغيره من العلوم الشرعية وذكر اللّٰه تعالٰى وهذا مذموم من أىّ شعر كان، فأمّا إذا كان القرآن والحديث وغيرهما من العلوم الشرعية هو الغالب عليه، فلا يضر حفظ اليسير من الشعر مع هذا لأن جوفه ليس ممتلئاً شعراً، واللّٰه أعلم. واستدل بعض العلماء بهذا الحديث على كراهة الشعر مطلقاً قليله وكثيره وإن كان لافحش فيه، وتعلّق بقوله صلى اللّٰه عليه وسلم: ''خذوا الشيطان''. وقال العلماء كافة هو مباح مالم يكن فيه فحش ونحوه، قالوا: وهو كلام حسنه حسن و قبيحه قبيح. وهذا هو الصواب، فقد سمع النبى صلى اللّٰه عليه وسلم الشعر واستنشده وأمر به حسّان فى هجاء المشركين وأنشده أصحابه بحضرته فى الأسفار وغيرها وأنشده الخلفاء وأئمة الصحابة وفضلاء السلف ولم ينكره أحد منهم على إطلاقه، وإنما أنكروا المذموم منه وهو الفحش ونحوه. وأما تسمية هذا الرجل الذى سمعه ينشد شيطاناً، فلعله كان كافراً أو كان الشعر هو الغالب

عليه، أو كان شعره هذا من المذموم، و بالجملة فتسميته شيطاناً إنما هو قضية عين تتطرق إليها الاحتمالات المذكورة وغيرها ولا عموم لها، فلا يحتج بها، والله أعلم". (51)

ترجمہ: ابوعبید اور تمام علماء کا قول ہے: صحیح بات یہی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ شاعری اُس پر غالب اور مسلط ہو، اس طرح کہ اُسے قرآن اور دیگر علوم شرعیہ نیز اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کردے اور یہ قابل مذمت ہے، خواہ کسی بھی نوعیت کی شاعری ہو، لیکن اگر قرآن وحدیث اور دیگر علوم شرعیہ کسی پر غالب ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ کسی قدر شاعری کے حفظ کرنے میں کوئی نقصان نہیں، کیونکہ اس صورت میں اس کا پیٹ شاعری سے بھرا ہوا قرار نہیں پاتا، واللہ اعلم۔ بعض علماء نے اس حدیث سے شاعری کے مطلقاً مکروہ وناپسندیدہ ہونے پر استدلال کیا ہے، خواہ وہ تھوڑی ہو یا زیادہ اور خواہ اُس میں کوئی فحش بات نہ ہو اور اس سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو دلیل بنایا ہے کہ: خذوا الشیطان (شیطان کو پکڑلو)۔

جبکہ (کم وبیش) تمام علماء کا کہنا ہے کہ شاعری مباح ہے جب تک اس میں کوئی فحش یا فحش نما چیز نہ ہو اور ان کا کہنا ہے کہ: وہ ایک صنف کلام ہے جس کا اچھا حصہ اچھا ہے اور برا، برا ہے اور یہی صحیح بات ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شعر سنے اور سننے کی فرمائش کی اور حسان بن ثابت کو شاعری کے ذریعے مشرکین کی ہجو کرنے کا حکم دیا ہے، نیز آپ کے اصحابؓ نے سفروں میں اور دیگر مواقع پر آپ کی موجودگی میں شعر پڑھے اور خلفاء وآئمہ صحابہ، نیز فضلائے سلف نے شعر پڑھے، مگر اُن میں سے کسی ایک نے بھی اس کو مطلقاً غلط نہیں جانا، بلکہ اِس میں سے صرف قابل مذمت یعنی فحش اور اُس سے ملتی جلتی شاعری کو ناپسند کیا اور اس شخص کو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعر

پڑھتے سنا اور اسے شیطان کا نام دیا، تو شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ کافر تھا یا شاعری اس پر غالب تھی یا اس کے شعر قابل مذمت تھے و بالجملہ اس (شاعر) کو شیطان کا نام دینا ایک خاص مسئلہ ہے جس کے بارے میں مذکورہ وغیر مذکورہ کئی احتمالات ہیں۔ اسے نہ تو عمومی فیصلہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے دلیل پکڑی جا سکتی ہے، واللہ اعلم (اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے)۔

تفسیر و حدیث کے عظیم الشان سرمائے کے مطالعے سے شاعری کے بارے میں جو کچھ رہنمائی میسر آتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

1- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شاعر نہ تھے اور شاعری آپ کی عظیم الشان شخصیت کے شایان شان نہیں۔

2- شعراء اس بناء پر قابل مذمت ہیں کہ وہ:

الف۔ جھوٹ سچ اور ہر قسم کے رطب و یابس پر مبنی کلام دلفریب کے ذریعے بدی اور گمراہی کی طرف لوگوں کو مائل کرنے اور گمراہ لوگوں کو اپنے پیچھے لگانے کا غلط کام کرتے ہیں۔

ب۔ وہ ہر وادی کلام میں جائز و ناجائز اور حسین و قبیح کی پرواہ کئے بغیر طبع آزمائی کرتے ہیں اور اس سلسلے میں کسی قاعدہ و ضابطہ کے پابند نہیں ہوتے۔

ج۔ ان کے قول و فعل میں بالعموم تضاد ہوتا ہے اور ان تینوں باتوں سے بہت سا فساد اور بگاڑ پیدا ہو کر معاشرے کو انفرادی و اجتماعی سطح پر متاثر کرتا ہے۔

3- وہ شعراء اس مذمت سے مستثنیٰ قرار پائے جو ایمان اور عمل صالح کے حامل اور اللہ کا بکثرت ذکر کرنے والے ہیں اور جنہوں نے دشمنوں کی جانب سے کی جانے والی زیادتیوں کے بعد اسلام، نبیؐ اسلام اور پیروان اسلام کی مدافعت میں جوابی حملہ کیا جس میں کوئی غلط بیانی نہیں، بلکہ دشمنان دین کی کمزوریوں اور خامیوں سے فائدہ اُٹھایا گیا۔

4- غیر مسلم شعراء کا کلام اگر صحیح خیالات پر مبنی اور دین سے متصادم نہ ہوتو اس سے استفادہ جائز ہے، حتیٰ کہ اس کو خراج تحسین پیش کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں (جیسا کہ أمية بن أبي الصلت کے شعروں کا معاملہ ہوا)۔

5- شاعری ایک صنف کلام ہے جس میں حسن و حکمت اور قبح و جہالت ہر دو پائے جاتے ہیں، چنانچہ کلام شاعر میں (خواہ مسلم کا ہو یا غیر مسلم کا) عمدہ و پُر حکمت، قابل محبت اور فحش و خرافات پر مبنی قابل مذمت ہے۔ شعر کہنا، شعر پڑھنا، شعر سننا، حفظ شعر اور روایت شعر بذات خود ممنوع نہیں، کلام قبیح نہ ہو تو جائز ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود شعر سنے، سننے کی خواہش ظاہر کی اور شعروں پر اظہار رائے فرمایا، اگر آپ نے شاعری نہیں کی تو اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں، جن میں نمایاں ترین دلیل یہ ہے کہ شاعری آپ کے عظیم الشان منصب و مرتبہ کے شایان شان نہیں۔

6- غیر فحش اور جائز شاعری بھی اس وقت قابل مذمت ہے جب وہ کسی پر اتنی غالب آجائے کہ متعلقہ فرد یا گروہ کو دین کے فرائض، ذمہ داریوں، یاد خدا اور کتاب خدا سے غافل کرنے کا باعث بنے یا اس کی راہ میں حائل ہو جائے، یعنی دین اور دینی تقاضے مقدم ہیں اور کسی قسم کی شاعری بھی ان کی راہ میں حائل نہ ہونی چاہئے۔

قرآن وسنت کی روشنی میں شاعری کے بارے میں اسلام کا جو نقطۂ نظر سامنے آتا ہے، اس سلسلے میں امام نوویؒ کی رائے جو انہوں نے أمية بن أبي الصلت کے اشعار کے بارے میں روایت کردہ حدیث کی شرح کے طور پر ظاہر فرمائی ہے، اختصار اور جامعیت کی حامل ہے اور اسے بطور نتیجہ پیش کیا جاسکتا ہے، آپ فرماتے ہیں:

''ومقصود الحديث أن النبي صلى الله عليه وسلم استحسن شعر امية واستزاد من إنشاده لما فيه من إقرار الوحدانية والبعث، ففيه جواز إنشاد الشعر الذى لا فحش فيه وسماعه

سواء شعر الجاهلية وغيرهم، وان المذموم من الشعر الذی
لا فحش فیه إنما ھو الإکثار منه و کونه غالباً علی الانسان،
فأما یسیره، فلا بأس بإنشاده و سماعه وحفظه"۔(52)

ترجمہ: اس حدیث کا مقصود و مفہوم یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمیہ بن ابی صلت کے اشعار کی تحسین کی اور مزید سنانے کی فرمائش کی، کیونکہ ان میں وحدانیت و قیامت کا اقرار تھا۔ پس اس میں اس شاعری کے سننے سنانے کا جواز فراہم ہوتا ہے، جو فحش نہ ہو، خواہ وہ (قبل از اسلام) زمانہ جاہلیت کی شاعری ہو یا کوئی اور نیز یہ کہ غیر فحش شاعری بھی اُس وقت قابل مذمت ہے جب اس کی اتنی کثرت ہوجائے کہ وہ انسان پر غلبہ پالے۔ پس جہاں تک اس سے کم کا تعلق ہے تو اس کے سننے، سنانے اور یاد کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

مقالہ کے اختتام سے پہلے مختصراً یہ دیکھنا بھی مناسب ہوگا کہ صحابہ کرامؓ اور دیگر صالحین اُمت کا شعر کے بارے میں طرز عمل کیا رہا، تاکہ نہ صرف قرآن وسنت کے علمبردار اولین حضرات کا شاعری کے بارے میں رویہ سامنے آسکے، بلکہ اس نظریہ کی عملی تردید بھی ہوجائے کہ شاعری کوئی ایسی غیر صالح چیز ہے جس سے نیک لوگوں کو مکمل پرہیز کرنا چاہئے۔

کعب بن زہیر کے قبول اسلام کا واقعہ ادب وتاریخ کی کتب میں معروف ہے۔ کعب کی ہجو یہ شاعری سے دعوت دین کو نقصان پہنچ رہا تھا، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا خون مباح قرار دے دیا کہ کعب بن زہیر جہاں بھی مل جائے، اسے قتل کردیا جائے۔ پھر کعب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں حاضری دے کر معافی چاہی، اسلام قبول کیا اور اپنا مشہور لامیہ قصیدہ پڑھا جس کا مطلع ہے:

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول
متیّم إثرھا لم یفد مکبول

ترجمہ: سعاد جدا ہوگئی، پس آج میرا دل غمزدہ ہے اور اس کے پیچھے پیچھے اس زنجیروں میں جکڑے ہوئے قیدی کی طرح جارہا ہے جس کا فدیہ دے کر اُس کو چھڑایا نہ گیا ہو۔

اس قصیدہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح تھی۔ ابن عبدربہ نے ''العقد الفرید'' میں قصیدہ کے ابتدائی اشعار نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''ثم خرج من هذا إلى مدح النبي صلى الله عليه وسلم، فكساه برداً اشتراه منه معاوية بعشرين ألفاً''. (53)

ترجمہ: پھر کعب بن زہیر نے ابتدائی اشعار کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ونعت کے اشعار کہے۔ پس آپ علیہ السلام نے انہیں انعام کے طور پر اپنی چادر پہنائی، جسے بعد ازاں ان سے حضرت معاویہؓ نے بیس ہزار میں خرید لیا۔

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن زہیر کو نہ صرف معاف کیا بلکہ یہ نعتیہ قصیدہ سن کر بطور انعام اپنی چادر مبارک عطا فرمائی جسے امیر معاویہؓ نے بیس ہزار میں ان سے خرید لیا۔

حضرت حسانؓ بن ثابت کو ہجو کفار اور مدح مصطفیٰ ﷺ کی بناء پر سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں جو عظیم الشان مقام و مرتبہ حاصل تھا، اس کا اندازہ تفسیر وحدیث کے گزشتہ حوالوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک، خادم النبی ﷺ جو خود شاعر تھے، ان کا بیان ہے:

"قدم علينا رسول الله صلى الله عليه وما في الأنصار بيت إلا وهو يقول الشعر، قيل له: وأنت أبا حمزة؟ قال: وأنا ايضاً". (54)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہمارے پاس (مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ) تشریف لائے تو انصار کے گھرانوں میں سے کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں شاعری نہ ہوتی ہو، (انسؓ سے) پوچھا گیا کہ اے ابوحمزہؓ، آپ بھی شعر کہتے تھے؟ تو فرمایا: ہاں میں بھی۔

مقداد بن اسد ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خوبیاں بیان کرتے

ہوئے فرماتے ہیں:

"ما كنت أعلم أحداً من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم أعلم بشعر ولا فريضة من عائشه رضي الله عنها". (55)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ میں سے میرے علم کے مطابق ایسا کوئی نہ تھا جو شاعری اور فرائض کے بارے میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ علم رکھتا ہو۔

شعر کی عظمت کے اعتراف میں حضرت عمرؓ بن الخطاب کا واقعہ "العقد الفريد" میں منقول ہے:

"ودخل هرم بن سنان على عمر بن الخطاب، فقال له: من أنت؟ قال: أنا هرم بن سنان، قال: صاحب زهير؟ قال: نعم، قال: أما انه كان يقول فيكم فيحسن، قال: كذلك كنا نعطيه فنجزل، قال: ذهب ما أعطيتموه وبقي ما أعطاكم". (56)

ترجمہ: ہرم بن سنان (امیر المومنین) عمرؓ بن خطاب کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا: میں ہرم بن سنان ہوں۔ آپ نے فرمایا: زہیر بن ابی سُلمیٰ کے صاحب؟ اُس نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: وہ تم لوگوں کے بارے میں عمدہ شعر کہتا تھا۔ اُس نے کہا کہ ہم بھی اُسے گراں قدر انعامات دیتے تھے۔ آپ نے فرمایا: جو تم لوگوں نے اُس کو دیا وہ (مال) تو ختم ہوگیا، مگر جو (شاعری کی صورت میں) اُس نے تمہیں دیا، وہ اب تک باقی ہے۔

حضرت عمرؓ کا ایک اور قول شعر کی عملی افادیت کو ظاہر کرتا ہے، آپ نے فرمایا:

أفضل صناعات العرب الأبيات من الشعر يقدّمها في حاجاته ليستعطف بها قلب الكريم ويستميل بها قلب اللئيم". (57)

ترجمہ: عربوں کی صنعت گری میں سب سے افضل وہ ابیات شعر ہیں جو کوئی عرب اپنی

حاجات میں پیش کرتا ہے، تاکہ اُن کے ذریعے کریم النفس کے دل کو مہربان کرے اور کمینے بخیل کے دل کو اپنی طرف مائل کرے۔

تفسیر ''روح المعانی'' میں سیدنا عمرؓ اور سیدنا علیؓ کے یہ قول درج ہیں:

فعن عمر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ أنہ کتب إلی أبی موسی الأشعری:

''مر من قبلک بتعلّم الشعر فانہ یدلّ علی معانی الأخلاق وصواب الرأی ومعرفۃ الأنساب۔

وعن علی کرم اللّٰہ تعالیٰ وجھہ: الشعر میزان القول''۔[58]

ترجمہ: عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے (امیر) ابوموسیٰ اشعریؓ کو لکھا: آپ کے سامنے جو بھی لوگ ہیں، انہیں شعر وشاعری کا علم سیکھنے کو کہیں، کیونکہ یہ معانی اخلاق، اصابت رائے اور معرفت انساب کی دلیل ہے۔

اور علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے یہ قول روایت ہے کہ: شاعری میزان کلام ہے۔

''العقد الفرید'' میں سیدنا عمر فاروق اور پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے اقوال شعر کے حق میں نقل کئے گئے ہیں:

''وقال عمر بن الخطاب: الشعر جذل من کلام العرب یسکن بہ الغیظ وتطفأ بہ النائرۃ ویبلغ بہ القوم فی نادیھم ویعطی بہ السائل۔

فقال ابن عباس: الشعر علم العرب ودیوانھا فتعلموہ، وعلیکم بشعر الحجاز''۔[59]

ترجمہ: عمرؓ بن خطاب نے فرمایا: شاعری کلام عرب کی بنیاد ہے جس کے ذریعے غیظ وغضب کو ختم کیا جاتا ہے، آگ کو بجھایا جاتا ہے، لوگوں کی محفل تک رسائی حاصل کی جاتی ہے اور سائل کو عطا کیا جاتا ہے۔

ابن عباس نے فرمایا: شاعری عربوں کا علم و دیوان ہے، پس اسے سیکھو اور تمہیں حجاز کی شاعری جاننا چاہئے۔

ابن عباسؓ ہی کا قول ہے:

''اذا قرأتم شیئًا من کتاب اللّٰہ فلم تعرفوہ، فاطلبوہ فی أشعار العرب فان الشعر دیوان العرب''۔[60]

ترجمہ: جب تم اللہ کی کتاب (قرآن) پڑھو، پھر تم اس کے الفاظ نہ سمجھ پاؤ تو ان (کے معانی) اشعارِ عرب میں تلاش کرو، کیونکہ شاعری عربوں کا دیوان ہے۔

ان اقوالِ صحابہؓ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انصارِ مدینہ میں بھی اہلِ مکہ کی طرح شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ بعثتِ نبوی کے بعد صحابہ کرامؓ نے شاعری سے استفادہ کیا، اس کی افادیت کا اعتراف کیا اور مختلف ضروریات کے تحت عربی شاعری کے تعلم کی ہدایت کی۔ جہاں تک صحابہؓ کے خود شعر کہنے کا تعلق ہے، اس بارے میں کچھ باتیں العقد الفرید اور بعض تفسیر روح المعانی سے نقل کی جارہی ہیں، تاکہ جو براہِ راست استفادہ کرنا چاہے وہ کم از کم وقت میں زیادہ معلومات حاصل کرسکے، کیونکہ یہ دونوں کتابیں معروف اور عام طور پر قابلِ حصول ہیں۔

ابن عبد ربہ کا بیان ہے:

کان شعراء النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم حسّان، وکعب بن مالک وعبداللّٰہ بن رواحۃ. قال سعید بن المسیّب: کان أبوبکر شاعراً وعمر شاعراً وعلی أشعر الثلاثہ.[61]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شعرا حسانؓ (بن ثابت) کعبؓ بن مالک اور عبداللہؓ بن رواحہ تھے۔ سعید بن مسیّبؒ کا قول ہے کہ: ابوبکرؓ شاعر تھے، عمرؓ بھی شاعر تھے اور علیؓ ان تینوں میں شعر گوئی کے لحاظ سے سبقت رکھتے تھے۔

العقد الفرید میں ابن عبد ربہ نے سیدہ عائشہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"فكان ابو بكر إذ أخذته الحمّى يقول:

كل امرئ مصبح في أهله   والموت أدنٰى من شراك نعله[62]

ترجمہ: ابوبکرؓ کو جب بخار ہوتا تو آپ یہ شعر پڑھتے:

ہر شخص اپنے گھر والوں کے درمیان صبح اُٹھتا ہے اس حال میں کہ موت اُس کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ اس سے قریب ہوتی ہے۔

علامہ آلوسی نے روح المعانی میں امیر المؤمنین ابوبکر صدیق ؓ کے یہ اشعار درج کئے ہیں:

''أمن طيف سلمى بالبطاح الدمائث   أرقت وأمر في العشيرة حادث

ترى من لوئي فرقة لا يصدّها   عن الكفر تذكير ولا بعث باعث

رسول أتاهم صادق فتكذّبوا   عليه وقالوا لست فينا بماكث

ولمّا دعوناهم إلى الحق أدبروا   وهرّوا هرير المجحرات اللواهث

فكم قد مثلنا فيهم بقرابة   وترك التقى شئ لهم غير كارث

فان يرجعوا عن كفرهم وعقوقهم   فما طيّبات الحل مثل الخبائث

وان يركبوا طغيانهم وضلالهم   فليس عذاب الله عنهم بلابث[63]

ترجمہ: کیا تم سنگریزوں والی نرم زمین پر سلمٰی کے خیال سے بے چین ہو گئے ہو جبکہ قبیلہ میں ایک نئی بات پیش آ چکی ہے۔

تم بنی لوئی میں ایک گروہ ایسا دیکھو گے جسے کفر سے نہ تو کوئی نصیحت روک پا رہی ہے نہ کسی جوش دلانے والے کا جوش۔ ان کے پاس رسولِ صادق آئے تو انہوں نے اُن کو جھٹلا دیا اور کہنے لگے کہ آپ ہم میں نہیں رہ سکتے۔

اور جب ہم نے انہیں حق کی دعوت دی تو انہوں نے منہ موڑ لیا اور ہانپتے ہوئے پیچھے رہ جانے والے جانوروں کی طرح آوازیں نکالنے لگے۔

اور ہم نے ان کے معاملے میں رشتے داری کا بہت خیال کیا، جبکہ اُن کے لئے تقویٰ کو

ترک کرنا کوئی غم انگیز معاملہ نہیں۔

اگر وہ اپنے کفر اور نافرمانی سے بعض آجائیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ حلال پاکیزہ چیزیں حرام وناپاک چیزوں جیسی نہیں ہوتیں۔

اور اگر وہ اپنی سرکشی وگمراہی پر اڑے رہے، تو اللہ کا عذاب ان سے رُکنے والا نہیں ہے۔

امیر المؤمنین عمر وعثمان رضی اللہ عنھما کے چند اشعار بحوالہ ''روح المعانی'' درج ذیل ہیں۔

ومن شعر عمر رضی اللّٰہ عنه وكان من أنقد أهل زمانه للشعر وأنفذهم فيه معرفة:

توعّدني كعب ثلاثاً يعدّها ولا شک أن القول ما قاله كعب

وما بي خوف الموت إني لميت ولكن خوف الذنب يتبعها الذنب [64]

ترجمہ: اورعمر رضی اللہ عنہ کے اشعار میں سے، جوکہ اپنے زمانے کے عظیم ترین اہل نقد ونظر اور اصحاب معرفت میں سے تھے، یہ شعر بھی ہیں:

کعب (الاحبار) نے میرے بارے میں تین یوم کا حساب لگا کر مجھے موت سے ڈرایا ہے اور بے شک صحیح بات وہی ہے جو کعب نے کہی ہے۔

مجھے موت کا تو خوف نہیں کیونکہ بالآخر مجھے مرنا ہے، مگر مجھے ان خطاؤں اور لغزشوں (کے حساب کتاب) کی وجہ سے خوف آتا ہے جو یکے بعد دیگرے سرزد ہوتی ہیں۔

ومن شعر عثمان رضی الله تعالیٰ عنه:

غنى النفس يغني النفس حتى يكفّها

وإن عضّها حتى يضرّ بها الفقر [65]

ترجمہ: اورعثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اشعار میں سے یہ شعر ہے:

نفس کی امیری نفس کو بے نیاز کردیتی ہے، یہاں تک کہ اگر اسے کاٹ کھائے اور فقر و

فاقہ سے مار ڈالے، تب بھی ہاتھ پھیلانے سے روکے رکھتی ہے۔

امیر المؤمنین علیؓ کے بارے میں ابن عبدربہ کا بیان ہے:

قال سعید بن المسیّب:

کان ابوبکر شاعراً وعمر شاعراً وعلیّ اشعر الثلاثه.

ومن قول علی کرم الله وجهه بصفین.

لمن رایة سوداء یخفق ظلها إذا قیل قدّمها حصین تقدّما

فیوردها فی الصف حتی یردّاها حیاض المنایا تقطر السم والدّما

جزی الله عنی والجزاء یکفّه ربیعة خیراً ما أعفّ وأکرما(66)

ترجمہ: سعید بن مسیّب کا قول ہے کہ ابوبکرؓ شاعر تھے اور عمرؓ بھی شاعر تھے، جبکہ علیؓ ان تینوں میں سے شعر گوئی میں سبقت رکھتے تھے۔

اور علی کرم اللہ وجہہ کے جنگ صفین کے موقع پر اشعار میں سے درج ذیل ہیں:

اُس سیاہ علم کے لئے کون رہ جائے گا جس کا سایہ لرزتا ہے۔ جب کہا جائے کہ حصین اس کو آگے لاؤ تو وہ آگے آجاتا ہے۔

پس وہ اسے صف (اول) میں لے آتا ہے یہاں تک کہ (لڑائی کے بعد) اسے اس حالت میں واپس لے جاتا ہے کہ موت کے کنوؤں سے زہر اور خون ٹپک رہا ہوتا ہے۔

اللہ ربیعہ کو میری طرف سے جزائے خیر دے، اور جزائے الٰہی ہی انہیں ثابت قدم رکھتی ہے، وہ کتنے پاکیزہ اور عزت والے ہیں۔

سیدنا علیؓ کے بارے میں العقد الفرید کا مزید بیان ہے:

وکان إذا سار بأرض الکوفة یرتجز ویقول:

یاحبّذا السیر بأرض الکوفة

أرض سواء سهلة معروفة

تعرفها جمالنا المعروفة(67)

ترجمہ: آپ (علیؓ) جب کوفہ کی سرزمین پر چلتے تو رجز پڑھتے ہوئے فرماتے:

کوفہ کی زمین پر چلنا پھرنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ یہ سرزمین ہموار، نرم اور جانی پہچانی ہے۔

اسے ہمارے معروف اُمنت بھی پہچانتے ہیں۔

سیدنا علی کرم اللہ وجھہ سے کثیر تعداد میں اعلیٰ اشعار مروی ہیں۔ جہاں تک سیدہ فاطمہؓ زہراء کا تعلق ہے، ان سے بھی بعض اشعار مروی ہیں۔ علامہ آلوسی روایت کرتے ہیں:

ومن شعر فاطمة رضی اللّٰه تعالیٰ عنها قالته یوم وفاة أبیها علیه الصلاة والسلام:

ماذا علی من شمّ تربة أحمد　　أن لا یشمّ مدی الزمان غوالیا

صُبّت علیّ مصائب لو أنها　　صُبّت علی الأیام صرن لیا لیا [68]

ترجمہ: اور فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اشعار میں سے جو انہوں نے اپنے والد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے روز کہے، درج ذیل ہیں:

جو احمد مرسلؐ کی قبر کی مٹی کی خوشبو سونگھ لے، وہ اگر طویل عرصہ تک کوئی اور خوشبو نہ بھی سونگھے تو اُسے کیا پرواہ۔

مجھ پر اتنے مصائب و آلام آئے ہیں کہ اگر روشن دنوں پر وارد ہوتے تو وہ تاریک ہوکر راتوں میں بدل جاتے۔

علامہ آلوسی مزید لکھتے ہیں:

ومن شعر ابنه الحسن رضی اللّٰه تعالیٰ عنهما وقد خرج علی أصحابه مختضباً:

نسوّد أعلاها وتأبی أصولها

فلیت الذی یسودّ منها هو الأصل [69]

ترجمہ: اور آپ (فاطمہؓ) کے فرزند حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اشعار میں سے درج ذیل ہے جب کہ وہ خضاب لگا کر باہر تشریف لائے:

ہم ان (بالوں) کے اُوپر کے حصے تو سیاہ کر لیتے ہیں، مگر ان کی جڑیں سیاہ ہونے سے انکار کر دیتی ہیں۔ اے کاش ان کا وہ حصہ جو سیاہی کا اثر قبول کرتا ہے، اندر (جڑ) والا ہوتا۔

عمِ رسول ؐ عباس بن عبد المطلب ؓ اور عبد اللہ بن عباس ؓ بھی شاعر تھے۔

و من شعر العباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ یوم حنین یفتخر بثبوتہ مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:

ألا ھل أتی عرسی مکری و موقفی   بوادی حنین و الأسنۃ تشرع

وقولی إذا ما النفس جاشت لھا قری   وھام تدھدی والسواعد تقطع

وکیف رددت الخیل وھی مغیرۃ   بزوراء تعطی بالیدین و تمنع

نصرنا رسول اللّٰہ فی الحرب سبعۃ   وقد فرّ من قد فرّ عنہ فاقشعوا[70]

ترجمہ: اورعباس رضی اللہ عنہ کے اشعار میں سے وہ بھی ہیں جو آپ نے غزوۂ حنین کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ثابت قدم رہنے پر فخر کرتے ہوئے نظم کیے:

دیکھو، کیا میری دُلہن وادی حنین میں میری جائے وقوف واقدام پر اس وقت آئی ہے جب کہ نیزے لہرا رہے تھے۔

اور بتلاؤ کہ جب نفس کی مہمان نوازی نے جوش مارا (جنگ شدت اختیار کر گئی) اور کھوپڑیاں لڑھک اور کلائیاں کٹ رہی تھیں۔

تو میں نے کس طرح گھڑ سواروں کو اپنی اس کمان کے ساتھ پسپا کیا جو دونوں ہاتھوں کے ذریعے تیر برساتی اور دفاع کرتی ہے۔

ہم سات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ میں مدد فرمائی، جب کہ جس کسی نے فرار ہونا تھا فرار ہو چکا اور لوگ ان کے پاس سے منتشر ہو گئے تھے۔

''و من شعر ابنہ عبد اللّٰہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھما:

إذا طارقات الھمّ ضاجعت الفتی   وأعمل فکر اللیل واللیل عاکر

و باکرنی فی حاجۃ لم یجد لھا   سوای ولا من نکبۃ الدھر ناصر

فرجت بمالی همّه من مقامه　　و زایله هم طروق مسامر
و کان له فضل علیّ بظنّه　　بی الخیر انی للذی ظنّ شاکر (71)

ترجمہ: جب راتوں کو پریشان کرنے والے غم کسی نوجوان کے ساتھ بستر میں چپک جاتے ہیں اور وہ سخت تاریک رات میں فکر وغم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

پھر وہ صبح سویرے اپنی اس حاجت کے لئے میرے پاس آتا ہے جس کو پورا کرنے والا میرے علاوہ کوئی نہیں اور نہ ہی مصائبِ زمانہ میں کوئی اُس کا مددگار ہے۔

تو میں اپنے مال کے ذریعے اُس کے غم اور پریشانی کو اُس سے دُور کر دیتا ہوں اور راتوں کو دستک دینے والا رنج وغم اُس سے جدا ہو جاتا ہے۔

اور اُسے میرے بارے میں حسن ظن رکھنے کی وجہ سے مجھ پر فضیلت حاصل ہے، پس میں اُس کے حسنِ ظن کا شکرگزار رہوں۔

نیز العقد الفرید میں مذکور ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی بینائی جاتی رہی تو انہوں نے اشعار کہے:

وقال ابن عباس لمّا کف بصره:

إن یاخذ اللّٰه من عینی نورهما　　ففی لسانی و قلبی منهما نور
قلبی ذکی و عقلی غیر ذی دخل　　و فی فمی صارم کالسیف مشهور (72)

ترجمہ: اور ابن عباسؓ کی جب آنکھوں کی بینائی چلی گئی، تو انہوں نے یہ شعر کہے:

اگر اللہ نے میری دونوں آنکھوں کا نور لے لیا ہے تو کیا ہوا، میری زبان اور دل میں ان دونوں کی روشنی موجود ہے۔

میرا دل حساس و زود فہم ہے اور میرے دماغ میں کوئی خلل نہیں، نیز میرے منہ میں ایسی کاٹ دار زبان ہے جو بے نیام تلوار کی طرح ہے۔

مذکورہ بالا تمام اشعار سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان

اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نہ صرف شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے، بلکہ کئی جلیل القدر صحابہؓ خود شاعر تھے۔حسانؓ بن ثابت، کعبؓ بن مالک، عبداللہؓ بن رواحہ جیسے معروف شعراء بارگاہ رسالتؐ کے علاوہ خود خلفائے اربعہ ابو بکر وعمر وعثمان وعلی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین شعر گو تھے، سیدنا عباسؓ و معاویہؓ، سیدہ عائشہؓ و فاطمہؓ، سیدنا حسنؓ وحسینؓ اور عبداللہ بن عباسؓ سمیت، بہت سے اصحاب رسولؐ واہل بیت، مہاجرین وانصار رضی اللہ عنھم شعر کہتے تھے۔لہذا شعر گوئی سے اجتناب تقویٰ کی لازمی دلیل نہیں اور نہ ہی شعر گوئی کسی فرد کے غیر صالح ہونے کی نشاندہی کرتی ہے، بلکہ اس سلسلے میں متوازن بات وہی ہے کہ: ''**الشعر کلام فحسنه حسن و قبیحه قبیح**''۔

(شاعری ایک صنف کلام ہے، جس کا عمدہ حصہ اچھا ہے اور قبیح حصہ برا ہے)۔

صحابہ کرامؓ کے بعد بھی گزشتہ چودہ سو سال میں مفسرین، محدثین، فقہائے اسلام اور دیگر صلحائے اُمت شاعری کرتے رہے ہیں جو ایک الگ تفصیل طلب موضوع ہے، تاہم اس رائے کی تائید میں **العقد الفرید** کے حوالے سے چند سطریں انتہائی اختصار کے ساتھ نقل کی جارہی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے جلیل القدر علماء واولیاء بھی جولانگاہ شعر میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں، ابن عبدربہ لکھتے ہیں:

> ''**(ومن شعراء التابعين) عبيدالله بن عتبة بن مسعود وهو ابن أخي عبدالله بن مسعود صاحب رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو أحد السبعة من فقهاء المدينة، وله قال سعيد بن المسيّب: أنت الفقيه الشاعر**''۔(73)

ترجمہ: اور تابعی شعراء میں سے عبید اللہ بن عتبہ بن مسعود بھی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی عبداللہؓ بن مسعود کے بھائی ہیں۔آپ مدینہ کے سات نمایاں فقہاء میں سے تھے اور انہی کے بارے میں سعید بن میبّب نے فرمایا: آپ شعر گو فقیہ ہیں۔

"(ومن شعراء التابعين) عروة بن أذينة، وكان من ثقات أصحاب حديث رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم يروى عنه مالک.
ومن شعراء (الفقهاء المبرزين) عبداللّٰه بن المبارک صاحب الرقاق". (74)

ترجمہ: نیز ان تابعین میں سے جو شاعر بھی تھے، عروہ بن اُذینہؒ ہیں، جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے ثقہ اصحاب میں سے ہیں جن سے مالک بن انسؒ روایت کرتے ہیں:
اور نمایاں فقہاء میں سے جو شاعر بھی تھے، "کتاب الزہد والرقاق" کے مؤلف عبداللہ بن مبارکؒ بھی ہیں۔

پس گزشتہ چودہ صدیوں کے دوران میں عہدِ نبوی، دورِ صحابہؓ، عصرِ تابعینؒ اور بعد کے ادوار میں شاعری کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہا، کئی ایک جلیل القدر صحابہؓ و تابعینؒ اور ان کے بعد کے اہل علم و تقویٰ خود بھی شاعر تھے اور شعر کے قدر دان بھی۔ ان میں مفسرین، محدثین، مؤرخین، فقہاء و صوفیاء، ہر قسم اور ہر دور کے اہل علم و فضل شامل ہیں۔ پس شاعری کی تائید میں نا قابل تردید اور وزنی دلائل ہیں، شرط یہ ہے کہ کلام فحش نہ ہو اور شاعری اتنی غالب نہ آجائے کہ اسلام کا ماننے والا اس سے برتر دینی تقاضوں میں تساہل برتنے لگے۔

آخر میں شاعری کے اسلامی تصور کے بارے میں اس مضمون کے تمام تر مباحث کو سمیٹتے ہوئے اس کا اختتام عصر حاضر کے مشہور محقق اور دانشور ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی وقیع رائے پر کیا جا رہا ہے جو شاعری کے اسلامی تصور کی بڑی خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ عکاسی کرتی ہے:

"As for poetry the Prophet declared, "There are verses and poems which are full of wisdom, and there are discourses of orators which produce a magical effect". The Qur'an has discouraged immoral poetry. Following this direction, the Prophet surrounded himself by the best poets of the opoch, and showed them the road to follow and limits to observe, thus distinguishing between the good and the bad use of this great natural talent. The poetical works of Muslims are found in all languages and relate to all times, it would be impossible to describe them here even in the briefest manner. An Arab, however, finds himself always "at home" in this poetry, as is found out by the synonimity of terms: "Bait" means both a tent and a verse of two hemistiches, "misra" means not only the flap of a tent but also a hemistich, "sabab": is rope of the tent as well as the prosodical foot, "watad" means a tent peg as well as the syllables of the prosodical foot. These are but a few among great many peculiarities of the language."(75)

✿✿✿

حواشی

-1 ابن عبدربه: العقد الفرید، مصر، المطبعة الجمالية، 1331ھ،ج3، ص379.

-2 ابن عبدربه: العقد الفرید، ج3، ص 381.

-3 السیوطی: المزهر، مصر، المکتبة الازهرية، 1325ھ، ج2، ص 293.

-4 جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغة العربية، بیروت: دارمکتبة الحیاة، 1967م، الجزء الأول، ص87.

-5 احمد حسن الزیات: تاریخ الأدب العربی، القاهرة، مکتبة الانجلو المصرية، 1955م، ص 29-30.

6- Philip K. Hitti:History of the Arabs, London, Macmillan, 1956, P.92.

7- Philip K. Hitti:History of the Arabs, P.92.

8- Philip K. Hitti: History of the Arabs, P.94-95.

9- Philip K. Hitti:History of the Arabs, P.95.

10- P.K Hitti: History of the Arabs, P.92.

-11 القرآن (البقرة: 23-24).

-12 السیوطی: المزهر، مصر، المکتبة الأزهرية، 1325ھ، الجزء الثانی، ص293.

-13 الجاحظ: البیان والتبین، مصر، المکتبة التجارية الکبری، 1345ھ، الجزء الثانی، ص 28-29.

-14 القرآن (یس: 69).

-15 القرآن (الشعراء: 224 ـ 227).

-16 ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، مصر، المنار، 1347ھ، الجزء السادس، ص 253.

-17 ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، مصر، المنار، 1347ھ، الجزء السادس،

ص 253-254.

18- ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، مصر، المنار، 1347ھ، الجزء السادس، ص 255-256.

19- ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، مصر، المنار، 1347ھ، الجزء السادس، ص 257.

20- البغوی: معالم التنزیل، مصر، المنار، 1347ھ، الجزء السادس، ص 251-252.

21- البغوی: معالم التنزیل، مصر، المنار، 1347ھ، الجزء السادس، ص 252.

22- البغوی: معالم التنزیل، مصر، المنار، 1347ھ، الجزء السادس، ص 253.

23- البغوی: معالم التنزیل، مصر، المنار، 1347ھ، الجزء السادس، ص 257.

24- المحلی و السیوطی: تفسیر الجلالین، دمشق، الملاّح، 1383ھ، ص 498-499.

25- الزمخشری: الکشاف، مصر، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، 1365ھ، الجزء الثالث، ص: 343-344

26- الزمخشری: الکشاف، مصر، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، 1365ھ، الجزء الثالث، ص 344.

27- الزمخشری: الکشاف، مصر، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، 1365ھ، الجزء الثالث، ص، 344-345.

28- البیضاوی: أنوار التنزیل و أسرار التاویل، مصر، مصطفی البابی الحلبی، 1388ھ، الجزء الثانی، ص 169.

29- البیضاوی: أنوار التنزیل و أسرار التاویل، مصر، مصطفی البابی الحلبی، 1388ھ، الجزء الثانی، ص 169.

30- ملاحظہ ہوں (1) تفسیر "روح المعانی" تالیف علامہ آلوسی بغدادی، (2) سید قطب کی تفسیر "فی ظلال القرآن" اور (3) پاک و ہند کے علماء کی تفاسیر۔

31- البخاری: الجامع الصحیح، مصر، بولاق، 1315ھ، الجزء الثامن، ص 36.

32- البخاری: الجامع الصحیح، مصر، بولاق، 1315ھ، الجزء الثامن، ص 36.

33- البخاری: الجامع الصحیح، مصر، بولاق، 1315ھ، الجزء الثامن، ص 36.

34- البخاری: الجامع الصحیح، مصر، بولاق، 1315ھ، الجزء الثامن، ص 36.

35- الخطیب التبریزی: مشکوة المصابیح، بمبئی، قاضی ابراهیم بن قاضی نور محمد، 1295ھ، ص 402.

36- الخطیب التبریزی: مشکوة المصابیح، بمبئی، قاضی ابراهیم بن قاضی نور محمد، 1295ھ، ص 402.

37- البخاری: الجامع الصحیح، مصر، بولاق، 1315ھ، الجزء الثامن، ص 34.

38- الخطیب التبریزی: مشکوة المصابیح، بمبئی، قاضی ابراهیم بن قاضی نور محمد، 1295ھ، ص 402.

39- الخطیب التبریزی: مشکوة المصابیح، بمبئی، قاضی ابراهیم بن قاضی نور محمد، 1295ھ، ص 402-403.

40- الخطیب التبریزی: مشکوة المصابیح، بمبئی، قاضی ابراهیم بن قاضی نور محمد، 1295ھ، ص 401.

41- البخاری: الجامع الصحیح، مصر، بولاق، 1315ھ، الجزء الثامن، ص 35.

42- الخطیب التبریزی: مشکوة المصابیح، بمبئی، قاضی ابراهیم بن قاضی نور محمد، 1295ھ، ص 401.

43- الخطیب التبریزی: مشکوة المصابیح، بمبئی، قاضی ابراهیم بن قاضی نور محمد، 1295ھ، ص 401.

44- الخطیب التبریزی: مشکوة المصابیح، بمبئی، قاضی ابراهیم بن قاضی نور محمد، 1295ھ، ص 401.

45- البخاری: الجامع الصحیح، مصر، بولاق، 1315ھ، الجزء الثامن، ص 35.

46- مسلم: الجامع الصحیح، مصر، المطبعة الکستلیة، 1283ھ، الجزء الخامس، ص 72-73.

47- البخاری: الجامع الصحیح، مصر، بولاق، 1315ھ، الجزء الثامن، ص 36-37.

48- البخاري: الجامع الصحيح، مصر، بولاق، 1315هـ، الجزء الثامن، ص 37.

49- مسلم: الجامع الصحيح، مصر، المطبعة الكستلية، 1283 هـ، الجزء الخامس، ص 73.

50- مسلم: الجامع الصحيح، مصر، المطبعة الكستلية، 1283 هـ، الجزء الخامس، ص 74.

51- النووي: المنهاج في شرح مسلم بن الحجاج، مصر، المطبعة الكستلية، 1283هـ، الجزء الخامس، ص 74.

52- النووي: المنهاج في شرح مسلم بن الحجاج، مصر، المطبعة الكستلية، 1283هـ، الجزء الخامس، ص73-74.

53- ابن عبدربه: العقد الفريد، مصر، المطبعة الجمالية، 1331هـ، ج3، ص 391.

54- ابن عبدربه: العقد الفريد، مصر، المطبعة الجمالية، 1331هـ، ج3، ص 388.

55- ابن عبدربه: العقد الفريد، مصر، المطبعة الجمالية، 1331هـ، ج3، ص 382.

56- ابن عبدربه: العقد الفريد، مصر، المطبعة الجمالية، 1331هـ، ج3، ص 394.

57- ابن عبدربه: العقد الفريد، مصر، المطبعة الجمالية، 1331هـ، ج3، ص 382.

58- الآلوسي: روح المعاني، مصر، إدارة الطباعة المنيرية، 1353هـ، ج19، ص 150.

59- ابن عبدربه. العقد الفريد، ج3 (مصر: المطبعة الجمالية، 1331هـ) ص 386.

60- الآلوسي: روح المعاني، مصر، إدارة الطباعة المنيرية، 1353هـ، ج19، ص 150.

61- ابن عبدربه: العقد الفريد، مصر، المطبعة الجمالية، 1331هـ، ج3، ص 388.

62- ابن عبدربه: العقد الفريد، مصر، المطبعة الجمالية، 1331هـ، ج3، ص387.

63- الآلوسي: روح المعاني، مصر، إدارة الطباعة المنيرية، 1353هـ، ج19، ص 148.

64- الآلوسي: روح المعاني، مصر، إدارة الطباعة المنيرية، 1353هـ، ج19، ص 148.

65- الآلوسي: روح المعاني، مصر، إدارة الطباعة المنيرية، 1353هـ، ج19، ص 149.

66- ابن عبدربه: العقد الفريد، مصر، المطبعة الجمالية، 1331هـ، ج3، ص 388.

67- ابن عبدربه: العقد الفريد، مصر، المطبعة الجمالية، 1331هـ، ج3، ص 390.

68- الآلوسي: روح المعاني، مصر، إدارة الطباعة المنيرية، 1353هـ، ج19، ص 149.

69- الآلوسي: روح المعاني، مصر، إدارة الطباعة المنيرية، 1353هـ، ج19، ص 149.

70- الآلوسي: روح المعاني، مصر، إدارة الطباعة المنيرية، 1353هـ، ج19، ص149-150.

71- الآلوسي: روح المعاني، مصر، إدارة الطباعة المنيرية، 1353هـ، ج19، ص 150.

72- ابن عبدربه: العقد الفريد، مصر، المطبعة الجمالية، 1331هـ، ج3، ص 390.

73- ابن عبدربه: العقد الفريد، مصر، المطبعة الجمالية، 1331هـ، ج3، ص 389.

74- ابن عبدربه: العقد الفريد، مصر، المطبعة الجمالية، 1331هـ، ج3، ص 390.

75- Dr. Muhammad Hameedullah: Introduction to Islam, Kuwait, Intenational Islamic Federation of Students Organizations (IIFSO) 1977, P.200.

۲ـ شمس الدين السخاوى

بحيثيت مؤرخ

شمس الدین السخاوی
بحیثیت مؤرخ

شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی الشافعی (831-902ھ) نویں صدی ہجری کے نامور مصری عالم و مصنف ہیں، جن کی تقریباً دو سو تصانیف، حدیث، فقہ، تاریخ اور دیگر موضوعات پر ہیں۔[1] وہ عربی اسلامی تاریخ نویسی میں خصوصی مقام کے حامل ہیں۔ بحیثیت مؤرخ ان کے مقام و خصوصیات کے سلسلے میں مختلف اہل علم کی آراء نیز ان کی تصانیف کے مطالعہ سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں۔

1- السخاوی ایک کثیر التصانیف مؤرخ ہیں جن کی کتب، تاریخ کے متنوع موضوعات پر ہیں اور کتب تاریخ کی کسی ایک صنف تک محدود نہیں۔ اس لحاظ سے وہ ایک جامع الصفات مؤرخ ہیں جن کی نظر تاریخ نویسی کے تمام تقاضوں اور پہلوؤں پر ہے۔ ان کی تصنیف "الضوء اللامع لأهل القرن التاسع" اور "الإعلان بالتوبيخ لمن ذم التاريخ" نیز دیگر کتب تاریخ کا مطالعہ اس بات کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے۔

2- شمس الدین السخاوی صرف مؤرخ ہی نہیں بلکہ دیگر علوم وفنون بالخصوص فن حدیث میں بھی نویں صدی ہجری کے اجل علماء ومحدثین میں سے ہیں۔ اس لحاظ سے فن جرح وتعدیل کا پورا علم رکھتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف پورے حدیث لٹریچر کا عمیق مطالعہ اور اس سے مکمل استفادہ کیا ہے بلکہ راویان حدیث کی چھان پھٹک، احادیث کی صحت، حسن، ضعف اور دیگر پہلوؤں سے پوری واقفیت رکھتے ہیں، اس چیز نے انہیں علم تاریخ کے سلسلے میں بھی بڑا فائدہ دیا ہے اور تاریخی روایات کی جانچ پرکھ اور رد وقبول کے ضمن میں انہوں نے ایک محدث کی حیثیت سے اپنے مزاج کو بڑی حد تک برقرار رکھا ہے۔ اس طرح ان کی کتب تاریخ صحت وسند کے لحاظ سے بطور مجموعی

بڑی اہمیت اور ثقاہت کی حامل ہیں۔

3- السخاوی کی تاریخی اہمیت کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے تذکرہ نگاری اور دیگر تاریخی مباحث میں بطور مجموعی عدل و انصاف سے کام لیا ہے اور ایک مؤرخ کی حیثیت سے ذاتی رجحانات کو غالب نہیں آنے دیا، بلکہ ذاتی پسند و ناپسند سے قطع نظر ہر شخصیت کا تذکرہ اس کے شایانِ شان طریقے سے کیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ہمعصر، مدمقابل اور سخت مخالف علامہ جلال الدین السیوطی جیسے افراد کا نہ صرف اپنی تصنیف "الضوء اللامع لأهل القرن التاسع" میں تذکرہ کیا، بلکہ اس سلسلے میں تفصیلات بھی بیان کیں اور ایک صاف گو مؤرخ کی طرح ان کے جو عیوب السخاوی کے علم میں تھے، ان کا بھی کھلے لفظوں میں تذکرہ کردیا کیونکہ یہ عیوب اساساً ان کی ذات سے متعلق نہ تھے بلکہ علوم و فنون اور تصنیف و تالیف کے سلسلے میں ان کے مبینہ رویہ کے بارے میں تھے اور السخاوی نے اپنی شہادت اور ہمعصر اہل علم و فضل کی روایت کی بناء پر یہ باتیں لکھیں۔ جلال الدین السیوطی نے علامہ سخاوی کی تصانیف پر تنقید بالخصوص "الکاوی فی تاریخ السخاوی" کی صورت میں جو کچھ کہا، اس کے باوجود سیوطی کی کئی ایک خوبیوں کا بیان واعتراف السخاوی کی انصاف پسندی کی دلیل ہے۔ انہوں نے سیوطی کے عیوب و محاسن ہر دو بیان کئے ہیں اور ذاتی عصبیت کی بناء پر ان کے علمی مقام و مرتبہ پر پردہ نہیں ڈالا۔ اگر بعض جگہ السخاوی راہ اعتدال سے ہٹے ہیں تو یہ جزوی رویہ ہے۔ مجموعی رویہ وہی ہے جو ایک غیر جانبدار مؤرخ کا ہونا چاہئے۔ اگر بالفرض انہیں سیوطی کے سلسلے میں جانبدارانہ اور منفی رویہ کا حامل قرار دے بھی دیا جائے تو بقیہ دس ہزار سے زائد شخصیات کے حالات اس بات کا ناقابل تردید اور عظیم الشان ثبوت ہیں کہ شمس الدین السخاوی ایک غیر جانبدار اور انصاف پسند تراجم نویس و مؤرخ ہیں۔

سیوطی، ابن ایاس اور بعض دیگر علماء و مؤرخین نے سخاوی کی "الضوء اللامع" پر

شدید تنقید کی ہے، سیوطی لکھتے ہیں:

''ثم أکب علی التاریخ فأفنی فیه عمره، و أغرق فیه عمله وسلق فیه أعراض الناس، وملأہ بمساوی الخلق''۔ (2)

ترجمہ: پھر وہ تاریخ نویسی میں مشغول ہوگیا، پس اپنی زندگی اِس میں فنا کردی اور اس کام میں پوری طرح غرق ہوگیا اور اس میں لوگوں کی عزت وناموس کے بارے میں بدزبانی کی اور اسے مخلوق کی برائیوں سے بھر دیا۔

اور بقول ابن ایاس:

''و ألف تاریخاً فیه اشیاء کثیرة من المساوی فی حق الناس''۔ (3)

ترجمہ: اور اس (سخاوی) نے ایک تاریخ لکھی، جس میں لوگوں پر تنقید کے حوالے سے، بہت سی باتیں ہیں۔

ان ناقدین کی شدید مخالفانہ آراء کے باوجود بطورِ مجموعی ''الضوء اللامع'' ایک اہم ترین اور نادر المثال تاریخی تصنیف ہے جیسا کہ دورِ جدید کے عرب ادیب ومؤرخ جرجی زیدان نے بیان کیا ہے۔

''وقد تصدی معاصروه لانتقاده والتشنیع علیه، منهم السیوطی ألف فی انتقاده کتاباً سماه ''الکاوی فی تاریخ السخاوی'' ولا عبرة بذلک فان الکتاب نادر المثال فی بابه''۔ (4)

ترجمہ: اور سخاوی کے معاصرین نے ان پر تنقید وطعن زنی کی، ان میں سے سیوطی ہیں جنہوں نے اُن پر تنقید کے سلسلے میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ''الکاوی فی تاریخ السخاوی'' رکھا، مگر اس کے باوجود یقیناً سخاوی کی کتاب اپنے موضوع کے حوالہ سے نادر المثال ہے۔

-4 مؤرخ کی حیثیت سے السخاوی کا ایک اور قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اساتذہ اور ہمعصر علماء کا تذکرہ کرتے ہوئے دل کھول کر ان کی تعریف کی ہے اور ان

کے محاسن کا اعتراف کیا ہے جس سے بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ مبالغہ آمیزی اور حاشیہ آرائی سے کام لیا جارہا ہے مگر درحقیقت ایک مؤرخ کی حیثیت سے انہیں جو خوبیاں نویں صدی ہجری کے اہل علم وفضل میں نظر آئیں، انہوں نے ان کی تعریف و توصیف اورتاریخی لحاظ سے ان شخصیات کے مقام ومرتبہ کونمایاں کرنے میں کوئی کسر اُٹھانہیں رکھی، بلکہ ان کا حق ادا کردیا۔ اس دوران میں جہاں کہیں اپنا ذکر کیا ہے، وہاں بالعموم سادہ الفاظ استعمال کئے ہیں اوران میں سے بہت سی شخصیات کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا عجز وانکسار کے ساتھ اعتراف کیا ہے، مثلاً اپنے محبوب اُستاد ابن حجر عسقلانیؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''أحمد بن علي بن محمد بن محمد بن علي بن أحمد شيخي الأستاذ إمام الأئمة الشهاب ابو الفضل الكناني العسقلاني المصري ثم القاهري الشافعي''۔ (5)

ترجمہ: میرے شیخ، استاذ، اماموں کے امام، ابوالفضل شہاب، احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد، کنانی، عسقلانی، مصری، بعد ازاں قاہری، شافعی۔

5- السخاوی نے ایک تاریخ نگار کی حیثیت سے علاقائی تعصب وترجیح سے کام نہیں لیا اور نہ اپنی کتب تذکرہ وغیرھا کو کسی خاص علاقے تک محدود رکھا ہے، بلکہ ایک غیر جانبدار تذکرہ نگار کی حیثیت سے مصر کے علاوہ شام وحجاز، ہند وفارس غرض مختلف بلاد وامصار سے تعلق رکھنے والے اہل علم وفضل کا یکساں احترام کے ساتھ تذکرہ فرمایا ہے۔ اس طرح السخاوی ایک مؤرخ کی حیثیت سے عالمی سطح کی شخصیت ہیں، قومی یا علاقائی نہیں۔ الضوء اللامع کے مقدمہ میں اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جمعت فيه من علمته من أهل هذا القرن الذي أوله سنة أحدى و ثمانمائة، ختم بالحسنى، من سائر العلماء والقضاة والصلحاء والرواة والأدباء والشعراء والخلفاء والملوك

والأمراء والمباشرين والوزراء، مصرياً كان أو شامياً، حجازياً كان أويمنياً، رومياً أوهندياً، مشرقياً أومغربياً''۔[6]

ترجمہ: میں نے اس کتاب میں اپنے علم کے مطابق اس صدی کی ابتداسن 801ھ سے لے کر اس کے بخیر اختتام تک تمام علماء، قاضیان، صالحین، راویان، شعراء وادباء، خلفاء وشاہان، امراء وعاملین اور وزراء کے حالات جمع کر دیئے ہیں، خواہ وہ مصری تھے یا شامی، حجازی تھے یا یمنی، رومی تھے یا ہندی، مشرق کے رہنے والے تھے یا مغرب کے۔

(6) السخاوی نے اپنی مشہور تصنیف ''الضوء اللامع'' میں غیر مسلم اہل علم وفضل کے حالات بھی بیان کئے ہیں، جو اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ ایک مؤرخ کی حیثیت سے وہ دینی تعصبات سے بھی بالاتر ہیں اور مشاہیر کے تذکرہ میں مذہب کی بناء پر تفریق روانہیں رکھتے۔ اس سلسلے میں ''الضوء الامع'' میں خود بھی اشارہ کرتے ہیں۔

''بل وذكرت بعض المذكورين بفضل و نحوه من أهل الذمة''۔[7]

ترجمہ: بلکہ میں نے اس کتاب میں ذِمّیوں (غیر مسلموں) میں سے بھی بعض قابل ذکر اہل علم وفضل کا تذکرہ کیا ہے۔

(7) السخاوی کی تاریخی حیثیت کے سلسلے میں ایک اہم اور نمایاں بات یہ ہے کہ انہوں نے نویں صدی ہجری کے مشاہیر کا ذکر کرتے ہوئے خواتین کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ ان کا الگ سے بطور خاص ''معجم النساء'' کے زیر عنوان ذکر کیا اور اس کے لئے ایک ضخیم باب وقف کیا ہے جس میں ایک ہزار سے زائد فضیلت مآب خواتین کا تذکرہ ہے، مثلاً کتاب معجم النساء، حرف الهمزة کے تحت پہلی نامور خاتون کا تذکرہ یوں کیا ہے:

''(آسية) ابنة جارالله بن صالح بن أبي المنصور أحمد بن عبدالكريم بن أبي المعالي يحيى بن عبدالرحمن بن علي بن الحسين بن علي أم عبدالله و أم محمد ابنة المسند الجلال الشيباني الطبري الأصل المكّي الحنفي والدها الماضي.

ولدت في رجب سنة ست و تسعين و سبعمائة بمكة
و أجازلها في التي تليها فما بعدها خلق منهم محمد بن
محمد بن محمد السخاوي وسعد بن يوسف النووي و
محمد بن أبي بكر ابن سليمان البكري و عائشة ابنة ابن
عبدالهادي و ابن صديق و العراقي و الهيثمي بل سمعت على
أبي الحسن بن سلامة، وتزوجها أبو البقاء بن الضياء
فأولدها عدة، منهم أبو النجا محمد، و مات عنها فتأيّمت
بعده، أجازت لنا و ماتت في جمادى الأولى سنة ثلاث
و سبعين بمكة". (8)

ترجمہ: آسیہ بنت جار اللہ بن صالح بن ابی منصور احمد بن عبدالکریم بن ابی المعالی یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن علی بن حسین بن علی، ام عبداللہ وام محمد، جو کہ مسند جلال شیبانی، طبری الاصل، مکی، حنفی کی صاحبزادی ہیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ وہ رجب سن 796ھ میں مکہ میں پیدا ہوئیں۔

اُنہیں آئندہ سال اور بعد ازاں بہت سے لوگوں نے اجازتِ روایت دی جن میں محمد بن محمد بن محمد سخاوی، سعد بن یوسف نووی، محمد بن ابی بکر بن سلیمان بکری، عائشہ بنت ابن عبدالھادی، وابن صدیق، عراقی اور ھیثمی شامل ہیں بلکہ انہوں نے ابو الحسن بن سلامہ سے بھی سماعِ حدیث کیا۔ ان سے ابو البقاء بن ضیاء نے شادی کی۔ ان سے کئی بچے پیدا ہوئے جن میں سے ابو النجا محمد بھی ہیں۔ اُن کا شوہر اُن کی زندگی ہی میں وفات پا گیا اور وہ بیوہ ہوگئیں۔ اُنہوں نے ہمیں روایت حدیث کی اجازت دی۔ اُن کا انتقال جمادی الاولی سن 873ھ میں مکہ میں ہوا۔

(8) السخاوی نے اپنی تصانیف متعلق بہ تاریخ میں فقہی تعصبات کو بھی قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی۔ خود شافعی المذہب ہونے کے باوجود حنفی، مالکی، حنبلی وغیرہ علماء وفضلاء کا بڑی

عقیدت واحترام سے ذکر کیا ہے اور انکی عظمت کا اعتراف کھلے بندوں کیا ہے۔ ان کی تحریر میں کہیں بھی یہ بات نظر نہیں آتی کہ انہوں نے فقہی مسلک کی بناء پر کسی کو ناحق ترجیح دی ہو یا پس پشت ڈال دیا ہو۔ وہ ابن حجر عسقلانیؒ کے ساتھ ساتھ ابن الدمیری حنفیؒ، العز الحنبلیؒ اور الشمس القرانی المالکیؒ وغیرھم کا ذکر بھی پوری عقیدت اور احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ اسی طرح اہل فقہ اور اہل حدیث کے مابین بھی انہوں نے کوئی ذاتی ترجیح وتفصیل روا نہیں رکھی اور عدم تعصب کو ہر جگہ مقدم رکھا ہے۔

(9) السخاوی نے اپنی مشہور تصنیف ''الضوء الامع'' میں اپنے ذاتی حالات بھی کافی تفصیل سے بیان کئے ہیں اور اس سلسلے میں اساساً بیانیہ انداز اختیار کیا ہے، جہاں کہیں اپنے حق میں آراءنقل کی ہیں، ان میں بھی افراط وتفریط سے اجتناب کیا ہے، نہ بلاضرورت کسر نفسی سے کام لیا ہے نہ فخر بالنفس کا شکار ہوئے ہیں۔ اپنی ذات کا ذکر کرتے ہوئے صیغہ غائب ہی استعمال کیا ہے جس طرح کہ ایک اجنبی شخص کے حالات لکھے جارہے ہوں اور یہ آپ بیتی کے بجائے جگ بیتی ہو۔ آخر میں اپنی ذات کی کوتاہیوں اور خامیوں کا بھی اعتراف کیا ہے۔ اپنے حالات کے اختتام پر لکھتے ہیں:

''هـذا كـلـه وهـو عـارف بـنـفـسـه، معترف بالتقصير في يومه وأمسه، خبير بعيوبه التي لايطلع عليها، مستغفر لما لعله يبدو منها، لكنه أكثر الهذيان طمعاً في صفح الاخوان مع كونه في أكثره ناقلاً اعتقاداً بأنه فضل لمن كان له قائلاً، والله يسأل أن يحمله كما يظنون وأن يغفر له مالا يعلمون''۔ (9)

ترجمہ: اس سب کچھ کے باوجود مصنف اپنی ذات کو جانتا ہے، اپنی موجودہ اور گزشتہ کوتاہیوں کا اعتراف کرتا ہے، اپنے اُن عیوب ونقائص کو خوب جانتا ہے جن کے بارے میں کسی کو خبر نہیں۔ وہ بخشش کا طلب گار ہے اپنے سب گناہوں کے بارے میں جن میں سے شاید کچھ منظر عام پر آجائیں، لیکن وہ بہت سی غیر محتاط باتیں بھی رقم کرنے والا

ہے، کیونکہ وہ دوستوں سے درگزر کی اُمید رکھتا ہے، باوجود اس کے کہ وہ ان باتوں میں سے اکثر کا محض نقل و روایت کرنے والا ہے یہ اعتقاد رکھتے ہوئے کہ جس کسی نے انہیں بیان کیا ہے، وہ صاحب علم وفضل ہے۔ پس لوگوں کو اُس کے بارے میں جو حسن ظن ہے، وہ اللہ سے دُعا کرتا ہے کہ اسے اس کا مصداق بنائے اور جن گنا ہوں کے بارے میں لوگ نہیں جانتے، اللہ اُن کی مغفرت فرمائے۔

(10) ایک مؤرخ کی حیثیت سے السخاوی کے بارے میں یہ نقطہ بھی اہم ہے کہ انہوں نے آٹھویں صدی کے حوالہ سے اپنے استاد ابن حجر عسقلانی کی شروع کردہ تراجم نویسی کی روایت کو برقرار رکھا اور اس مقصد کے لئے اپنی عمر عزیز کا وافر حصہ صرف کیا۔ اس طرح بعد میں آنے والوں کے لئے ایک اہم اور قابل تقلید مثال چھوڑی جس کے تتبع میں صدی وار تذکرہ نویسی کی روایت آگے چلتی رہی اور ہزاروں اہل علم وفضل کے حالات وخدمات زمانے کی دستبرد سے محفوظ ہو کر کتابی شکل میں مدون ومرتب ہو گئے جو علمی تاریخی، ثقافتی اور مذہبی حوالوں سے بڑی قدر وقیمت کے حامل ہیں۔ چنانچہ نویں صدی کے حوالہ سے "الضوء اللامع" کے بعد نجم الدین الغزی نے دسویں صدی کے اعیان واعلام کے احوال میں ''الكواكب السائرة بأعيان المائة العاشرة" لکھی۔ محبّی نے "خلاصة الأثر في أعيان القرن الحادي عشـــــر" کے نام سے گیارہویں صدی کے اہل علم وفضل کے احوال جمع کئے اور بعد ازاں بھی مختلف اہل علم نے صدی وار تراجم یا احوال نویسی کا کام سرانجام دیا۔ حاجی خلیفہ کشف الظنون میں "الضوء اللامع" کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''هو تاريخ كبير في مجلدات جمع فيها الوفيات من 801 إلى سنة 900 مرتباً على حروف المعجم في الأسماء والآباء والجدود''.[10]

ترجمہ: وہ ایک ضخیم تاریخ ہے جو کئی جلدوں میں ہے۔ اس میں سخاوی نے سن 801 ھ سے

900ھ تک ''وفیات'' جمع کی ہیں نیز انہیں ناموں اور آباء و اجداد کے حوالے سے حروف معجم کے مطابق مرتب کیا ہے۔

نجم الدین الغزی نے صدی وار کتب تراجم میں ابن حجر کی "الدرر الکامنة" کے بعد شہرت وقدامت کے لحاظ سے "الضوء اللامع" کا ذکر کیا ہے:

''ویدور أقدم المشهور منها علی سیر أعیان القرن الثامن للهجرة وهو کتاب "الدرر الکامنة فی أعیان المائة الثامنة" لابن حجر العسقلانی وقد طبع، ویلیه الضوء اللامع لأهل القرن التاسع للسخاوی وقد طبع".(11)

ترجمہ: ان میں سے قدیم ترین مشہور کتاب آٹھویں صدی ہجری کے مشہور لوگوں کی سیرت و احوال سے متعلق ہے اور وہ ہے ابن حجر عسقلانی کی کتاب "الدرر الکامنة فی أعیان المائة الثامنة'' جو شائع ہو چکی ہے۔ اس کے بعد سخاوی کی کتاب "الضوء اللامع لأهل القرن التاسع'' ہے اور وہ بھی شائع ہو چکی ہے۔

مشہور مستشرق گب نے ابن حجر کو صدی وار تراجم نویسی کا بانی قرار دیا ہے:

"A novel method introduced by the historian Ibn-Hajr (d. 1449) was to compile contennial dictioneries.(12)

''ابن حجر کی ''الدرر الکامنة'' کا تعارف کرانے کے بعد گب نے سخاوی کی عظیم اور ضخیم تصنیف پر روشنی ڈالی ہے:

"For the next century, al-Sakhawi (d. 1497) produced a twelve volume dictionery, the twelfth volume of which is devoted to women".(13)

ان تمام حوالوں سے صدی وار تراجم نویسی کے سلسلے میں سخاوی کی کتاب "الضوء اللامع" کی اہمیت وافادیت بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔

-11 السخاوی نے بحیثیت تذکرہ نگار ہر شخصیت کا اس کے شایان شان ذکر کیا ہے اور ہر فرد کے مقام ومرتبہ کے لحاظ سے تفصیل یا اجمال کو ملحوظ رکھا ہے۔بعض شخصیات کا کافی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، مثلاً ابن حجر عسقلانی۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ وہ ان کے استاد تھے، بلکہ درحقیقت نویں صدی ہجری کا کوئی مورخ بھی ابن حجر کی عظمت کے تفصیلی تذکرہ سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اس کے برعکس بعض شخصیات کا محض چند سطروں میں ذکر کیا ہے جس کی وجہ بعض صورتوں میں اگرچہ میسر معلومات کی کمی بھی ہوسکتی ہے، مگر زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ اسی قدر مختصر تذکرہ کی ضرورت محسوس کی۔ اس طرح بحیثیت مؤرخ، السخاوی مجموعی لحاظ سے اختصار وجامعیت کے حامل ہیں جو ایک مؤرخ کے لئے ضروری ہے۔ اگر معلومات کی کمی کی بناء پر بھی بعض شخصیات کا ذکر انتہائی مختصر کیا ہے تب بھی ذکر نہ کرنے سے ذکر کردینا ان کا نام تاریخ میں محفوظ کرنے کی غرض سے بہتر ہے اور یہ مختصر تذکرہ بھی خوبی ہی شمار ہوگا، مثلاً آخری جلد کے اختتام پر (رقم 1075) کے تحت لکھتے ہیں:

"(مستولدة الفخری) ابی بکر بن ظهيرة أم ولده أفضل الدين ماتت فی شوالها"۔ (14)

ترجمہ: مستولدہ فخری، ابی بکر بن ظہیرہ، جو والدہ ہیں أفضل الدین بن ابوبکر بن ظہیرہ کی۔ ان کی وفات اس سال (898ھ) کے شوال میں ہوئی۔

-12 السخاوی نے ایک مؤرخ کی حیثیت سے ذیول نویسی کی روایت کو آگے بڑھایا جس کا فائدہ گزشتہ مورخین کے کام کی تنقیح وتکمیل ہے۔بعض اہم ذیول کے نام یوں ہیں:

(1) التبر المسبوک فی الذیل علی تاریخ المقریزی السلوک

(2) الذيل علی قضاة مصر لابن حجر و يسمی الذيل المتناه

(3) الذيل علی طبقات القراء لابن الجزری

(4) الذيل علی دول الاسلام للذهبی

(5) دفع التلبيس و رفع التجنيس عن الذيل الطاهر النفيس۔ (15)

13- السخاوی نے علم التاریخ میں تلخیص نویسی کی روایت کو بھی آگے بڑھایا اور مختلف کتب تاریخ کی تلخیص لکھی، مثلاً:

1- تلخيص تاريخ اليمن

2- تلخيص طبقات القرأ لابن الجزری

3- منتقی تاريخ مكة للفاسی ۔ (16)

(14) السخاوی کو طبقات نویسی میں بھی بڑی مہارت حاصل ہے، انہوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور بالخصوص علم فقہ کے سلسلے میں طبقات نویسی پر توجہ دی۔ بطور اشارہ ان کی چند تصانیف کے نام درج ذیل ہیں:

1- طبقات المالكية (فی أربعة اسفار تقريباً)

2- تقفيص قطعة من طبقات الحنفية

3- ترتيب طبقات المالكية لابن فرحون۔ (17)

15- ''الضوء اللامع'' کے علاوہ بھی السخاوی نے ایک سیرت نگار کی حیثیت سے بہت سا علمی کام سرانجام دیا اور سیرت وتراجم پر مبنی مستقل کتب ورسائل تحریر کئے جن سے بہت سی اہم، متنوع اور نادر المثال شخصیات کے احوال و آثار کو محفوظ کرنے میں بڑی مدد ملی۔ مثلاً:

1- الجواهر والدرر فی ترجمة شيخ الاسلام ابن حجر

2- المنهل العذب الروی فی ترجمة قطب الأولياء النووی

3- الاهتمام بترجمة النحوی الجمال بن هشام

4- القول المبین فی ترجمة القاضی عضد الدین

5- الاهتمام بترجمة الکمال بن الهمام

6- القول المنبّی فی ترجمة ابن العربی۔ (18)

16- السخاوی نے ایک مؤرخ کی حیثیت سے سفرنامے بھی لکھے ہیں جن کا تعلق بیک وقت تاریخ، سیرت، جغرافیہ اور ادب سے قرار دیا جا سکتا ہے اور اس طرح سخاوی سفرنامہ نگار بھی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کئی تصانیف ہیں، مثلاً:

1- الرحلة المکیة

2- الرحلة الاسکندریة و تراجمها

3- الرحلة الحلبیة و تراجمها۔ (19)

17- تاریخ نگاری کے سلسلے میں السخاوی نے مذکورہ بالا تمام کتب کے علاوہ بھی مختلف موضوعات پر متنوع کتب تصنیف کی ہیں، جو ان کی بحیثیت مؤرخ وسعت معرفت اور دقت نظر کا بین ثبوت ہیں اور انہیں ایک وسیع الفکر، دقیق النظر، متنوع الموضوعات اور پرنویس مؤرخ قرار دینے کا باعث ہیں، مثلاً:

1- التاریخ المحیط

2- تاریخ المدینتین

3- الفرجة بکائنة الکاملیة التی لیس فیها للمعارض حجة

4- أحسن المساعی فی إیضاح حوادث البقاعی

5- الشافی من الألم فی وفیات الأمم۔ (20)

18- مؤرخ کی حیثیت سے السخاوی کا ایک اہم کارنامہ علم تاریخ کی دینی و عمومی اہمیت کے ضمن میں بیش قیمت دلائل کی فراہمی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے دور تک

ہونے والے اہم کام کا مجموعی جائزہ پیش کیا ہے جس سے ان کتب کا مختصر تعارف ہو گیا ہے اور ساتھ ہی اس سے مسلمانوں کے ہاں تاریخ لٹریچر کی وسعت و اہمیت کا بھی اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ''الاعلان بالتوبیخ'' میں انہوں نے کافی شرح وسط سے کام لیا ہے۔ ''الاعلان بالتوبیخ'' کے بارے میں مشہور عرب عالم اور محقق احمد باشا تیمور کا ایک قول بڑا منفرد، مختصر اور جامع ہے اور یہ قول واحد ہی ''الاعلان بالتوبیخ'' کی صدیوں پر محیط عظمت و اہمیت کے اظہار کے لئے کافی ہے۔ یہ قول ''الاعلان بالتوبیخ'' کی طبع دمشق کے صفحہ اولی پر درج ہے:

یعتبر هذاالکتاب ''کتاریخ التاریخ فی الاسلام''.[21]

یہ کتاب اسلام میں تاریخ نویسی کی تاریخ قرار دی جاتی ہے

عربی زبان و ادب کے معروف پاکستانی استاد اور محقق پروفیسر عبدالقیوم ''اُردو دائرہ معارف اسلامیہ'' میں اپنے مقالہ ''السخاوی'' میں ''الاعلان بالتوبیخ'' کی اہمیت یوں واضح کرتے ہیں:

''السخاوی نے الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ (دمشق 1339ھ) میں علم تاریخ کی تدوین، اس کے اصول اور ارتقاء پر سیر حاصل بحث کی''۔[22]

19- السخاوی علم تاریخ میں تنقید نگاری کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کی مشہور تصنیف ''الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ'' مقدمہ ابن خلدون (م 808ء) کے بعد تاریخی تنقید نگاری (النقد التاریخی) کے سلسلے میں انتہائی اہم تصنیف سمجھی جاتی ہے جو گزشتہ پانچ صدیوں کے دوران مشرق و مغرب میں مسلسل پڑھی پڑھائی جارہی ہے۔ انہوں نے بڑے علمی انداز میں ناقدین علم تاریخ کے اعتراضات کو تفصیلاً نقل کر کے ان کا مدلل اور مسکت انداز میں جواب دیا ہے اور قرآن و حدیث نیز دیگر حوالوں سے علم تاریخ کی

ضرورت و اہمیت کے حق میں معرکۃ الآراء استدلال کیا ہے، جس سے تاریخ نگاری کی مذمت اور مخالفت کرنے والوں کے لئے گنجائش باقی نہ رہی۔

ڈاکٹر سید محمد یوسف ''الاعلان بالتوبیخ'' کے اُردو ترجمہ کے مقدمہ میں اس کتاب کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جب انحطاط کا دور آیا اور ہمتیں پست ہوگئیں تو تاریخ کا زائد از نصاب مطالعہ بے توجہی کا شکار ہوگیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگوں نے اس کی تنقیص شروع کردی۔ اس صورت حال سے سخاوی کو تشویش ہوئی تو انہوں نے ''الاعلان بالتوبیخ'' تصنیف کی۔ اس میں انہوں نے علمی طریقے پر تاریخ کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے، متقدمین کی تحریروں کے اقتباسات سے علم تاریخ کے شرف و مرتبے پر روشنی ڈالی ہے اور تاریخ میں مسلمانوں کے کوناگوں کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔''(23)

20- السخاوی نے ایک مؤرخ کی حیثیت سے اپنی تصانیف میں فصیح و بلیغ زبان استعمال کی ہے جس سے ان کی کتب تاریخ، ادبی اہمیت کی حامل بھی قرار پاتی ہیں اور السخاوی ایک انشا پرداز مؤرخ کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے الفاظ غریبہ سے اجتناب کیا ہے، عمدہ الفاظ و تراکیب استعمال کی ہیں، سوقیانہ زبان استعمال کرنے سے بھی احتراز کیا ہے اور دلنشین اسلوب و مؤثر پیرایہ بھی ان کی تاریخ نویسی کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ تشبیہات و امثال اور استعارہ و کنایہ کا بھی عمدہ و برمحل استعمال کیا ہے نیز جا بجا علم تاریخ کے سلسلے میں قرآن و حدیث سے استشہاد کیا ہے۔ اس طرح ان کی تصانیف بیک وقت تاریخی، ادبی اور دینی خوبیوں کی جامع بن گئی ہیں۔

ان تمام دلائل و نقاط سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شمس الدین السخاوی بحیثیت مؤرخ ایک عظیم الشان اور منفرد حیثیت کے حامل ہیں، جن کی تاریخی کتب، متنوع اور مختلف

موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ سند و روایت کے لحاظ سے بھی ان کی تصانیف کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ وہ بیک وقت حدیث و تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ بحیثیت مؤرخ سخاوی نسل، علاقہ اور مذہب کے تعصبات سے ماوراء ہیں اور ذاتی پسند و ناپسند کو بھی بطور مجموعی بالائے طاق رکھ کر انصاف پسندی اور غیر جانبداری سے کام لیتے ہیں۔ عظیم خواتین اور غیر مسلم مشاہیر کے مقام و اہمیت کا بھی انہیں بخوبی ادراک و احساس ہے اور انہیں اپنی کتب میں شایان شان مقام دیا ہے۔ ایک مؤرخ کی حیثیت سے اپنے اساتذہ و شیوخ کا تذکرہ احترام و تجلیل کے جذبات کے ساتھ بہترین الفاظ میں کرتے ہیں اور اپنا تذکرہ کرتے وقت افراط و تفریط سے اجتناب کی کوشش کی ہے۔ تراجم نویسی اور نقد تاریخی میں السخاوی عظیم مقام کے حامل ہیں اور ذیول نویسی، تلخیص نگاری، طبقات نویسی غرض مختلف اصناف تاریخ میں بیک وقت مہارت و تفوق کے حامل ہیں۔ درحقیقت نویں صدی ہجری میں اتنا عظیم الشان مؤرخ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، اگر وہ صرف ''الضوء اللامع'' ہی تصنیف کرتے تو گیارہ ہزار کے لگ بھگ اہل علم و فضل کا فصیح و بلیغ زبان میں تذکرہ ان کی تاریخی و ادبی عظمت کی کافی دلیل تھا، کجا کہ انہوں نے مختلف مجالات تاریخ میں بے شمار دیگر کتب بھی تصنیف کیں، بقول الشوکانی:

> ''ولو لم يكن لصاحب الترجمة من التصانيف إلا (الضوء اللامع) لكان أعظم دليل على إمامته، فانه ترجم فيه أهل الديار الاسلامية و سرد في ترجمة كل أحد محفوظاته و مقروء اته و شيوخه و مصنفاته و احواله و مولده و وفاته على نمط حسن و اسلوب لطيف ينبهر من لديه معرفة بهذا الشأن و يتعجب من إحاطته بذلک وسعة دائرته في الاطلاع على أحوال الناس''.(24)

ترجمہ: اگر صاحب احوال کی ''الضوء اللامع'' کے علاوہ اور کوئی تصنیف نہ ہوتی، تو بھی یہ کتاب اس کی امامت و فضیلت کی عظیم دلیل تھی، کیونکہ اُس نے اس کتاب میں

مما لک اسلامیہ کے رہنے والوں کے احوال بیان کئے ہیں اور ہر ایک کے احوال میں اُس کی حفظ شدہ اور قراءت شدہ روایات کا ذکر کیا ہے، نیز اُس کے شیوخ ومصنفات، حالاتِ زندگی، ولادت و وفات کا ذکر عمدہ طور پر لطیف اسلوب میں کیا ہے جس سے اس معاملے میں واقفیت رکھنے والا حیران ہوتا ہے اور لوگوں کے احوال کے بارے میں اُس کی معلومات کی وسعت اور جامعیت پر تعجب کرتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ بحیثیت مؤرخ السخاوی کی شخصیت بڑی جامع اور منفرد ہے جسے کسی اور سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ وہ ایک طرف متقدم مؤرخین کے علوم واسالیب کے حامل ہیں، دوسری جانب نقد تاریخی کے حوالہ سے ابن خلدون کے بعد اہم ترین شخصیت ہیں، تیسری طرف صدی وار تراجم نویسی پر مبنی ''الضوء اللامع'' کے حوالہ سے ابن حجر عسقلانی کے ایسے وارث ہیں جس کا مقام کیفیت وکمیت ہر دو لحاظ سے "الدرر الکامنة" کے مصنف سے بڑھ کر ہے اور چوتھی جانب تصانیف تاریخ کے تنوع اور قدر وقیمت کے لحاظ سے کسی بھی متقدم ومتاخر مؤرخ سے ان کا موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کی بحیثیت مؤرخ حیثیت ہمہ جہتی اور متنوع ہے۔ وہ نویں صدی ہجری کی عربی اسلامی تاریخ نویسی میں بالخصوص اور مجموعی مسلم تاریخ نویسی میں بالعموم ایک منفرد و یکتا مقام کے حامل ہیں اور العیدروسی کا یہ قول ان کی عظمت کی بیّن دلیل ہے کہ ان کے بعد مجموعی علوم وفنون کے حوالہ سے ان جیسا کوئی سامنے نہیں آیا۔

و لم یخلفه بعده مثله فی مجموع فنونه. (25)

ترجمہ: اُن کے بعد ان جیسا علوم وفنون کا جامع اور کوئی نہیں آیا۔

۞ ۞ ۞

(حواشی)

(1) سخاوی کے تفصیلی حالات اور اسمائے تصانیف کے لئے ملاحظہ ہوان کی تصنیف الضوء اللامع لأهل القرن التاسع، القاهرة، مكتبة القدسي، 1353-1355ھ، ج8،ص2-32۔

(2) جلال الدين السيوطي: نظم العقيان في أعيان الأعيان (حرزه الدكتور فيليب حتى) نيويورك، المطبعة السورية الأميريكية لصاحبها سلوم مكرزل، 1927م، ص 152۔

(3) ابن إياس: بدائع الزهور في وقائع الدهور أو تاريخ مصر، مصر (بولاق) المطبعة الكبرى الأميرية، الطبعة الأولى، 1311ھ، ج 2، ص 322۔

(4) جرجي زيدان، تاريخ آداب اللغة العربية، بيروت، دار مكتبة الحياة، 1967م، ج3، ص 178۔

(5) السخاوي، الضوء اللامع، ج 2، ص 36۔

(6) ایضاً، ج 1، ص 5 (مقدمة)۔

(7) ایضاً۔

(8) ایضاً، ج 12، ص 2۔

(9) ایضاً، ج 8، ص 32۔

(10) حاجي خليفة: كشف الظنون عن آسامي الكتب والفنون، بيروت، منشورات مكتبة المثنى، 1941م، ج 2، عمود 1089۔

(11) نجم الدين الغزى: الكواكب السائرة بأعيان المائة العاشرة)ضبط و تحقيق، جبرئيل سليمان جبور) بيروت، محمد امين دمج و شركاه، 1945م، ج 1، ص (ب) المقدمة۔

(12) H.A.R. Gibb: Arabic Literature, Oxford University Press, 1963, P.144.

(13) Ibid.

(14) راجع السخاوي، الضوء اللامع، ج 12، ص 167۔

(15) ایضاً، ج 8، ص 17 بعد۔

(16) ایضاً۔

(17) ایضاً۔

(18) ایضاً۔

(19) ایضاً، ص 16۔

(20) ایضاً، ص 17۔

(21) شمس الدین السخاوی، الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ، دمشق، مکتبة القدسی، مطبعة الترقی، 1349ھ، ص 1۔

(22) جامعہ پنجاب لاہور، اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، نیولائیٹ پریس و پنجاب یونیورسٹی پریس، 1393ھ/ 1974م، ج 1، ص 762 (مقالہ "السخاوی")۔

(23) شمس الدین السخاوی، الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ، اُردو ترجمہ از سید محمد یوسف، لاهور، مرکزی اُردو بورڈ، 1978م، مقدمہ، ص 21۔

(24) الشوکانی، البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع، القاهرة، مطبعة السعادة، الطبعة الأولی، 1348ه، ج 2، ص 186۔

(25) عبدالقادر العیدروسی، النور السافر عن أخبار القرن العاشر، (ضبط و تصحیح: محمد رشید أفندی الصفار) بغداد، المکتبة العربیة، مطبعة الفرات، 1353ھ / 1934م، ص 16۔

✿✿✿

۳۔ عرب و عجم
میں
مقامِ اقبال

عرب وعجم میں مقامِ اقبال

علامہ محمد اقبال (1877ء-1938ء) کی شخصیت وخدمات اور فکر وفن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور مشرق ومغرب کے مسلم وغیر مسلم اہل علم ودانش نے ان کے مقام ومرتبہ کا بلا حیل و حجت اعتراف کیا ہے۔ ان کی حیات وافکار پر دُنیا کی مختلف اہم زبانوں میں بے شمار تصانیف و خطبات، تحریر وتقریر میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ ان کے اُردو اور فارسی کلام کا دُنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے جن میں مغربی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی اور ترکی زبان، عالم اِسلام کے حوالہ سے بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

اقبال نے اپنی شخصیت اور کلام کے ذریعے برصغیر پاک وہند کے علاوہ عرب وعجم سمیت پورے عالم اِسلام میں احیائے اِسلام واتحادِ اُمت کی روح پھونکنے اور اسے اغیار کی فکری وسیاسی وعمومی غلامی سے آزاد کرانے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ لہٰذا جہاں ایک طرف مفکر و فلسفی نیز شاعر مشرق وانسانیت ہونے کے ناطے غیر مسلم دُنیا کے عظیم مفکرین ودانشوران وعامتہ الناس نے بڑے پیانے پر اقبال سے متاثر ہوتے ہوئے انہیں اپنے اپنے انداز میں خراج عقیدت پیش کیا ہے، وہیں عالم اِسلامی کے علماء ومفکرین وابنائے اُمت نے بھی بکثرت ان کی تعظیم وتجلیل کا حق ادا فرمایا ہے۔ اس حوالہ سے عربی، فارسی اور اُردو دان اقوام وممالک اسلامیہ خصوصی شرف وامتیاز کے حامل ہیں۔ چنانچہ اس مقالہ میں اختصار کے ساتھ عرب وایران و افغانستان نیز پاک وہند کے ممتاز علماء ومفکرین اور ادباء ومحققین کے اقوال وآراء کی روشنی میں شخصیت ومقام اقبال کی علمی وادبی تصویر کشی کی گئی ہے، تاکہ اہل نظر بالخصوص نسل نو سے تعلق رکھنے والے افراد متفرق ومنتشر علمی وادبی معلومات کا مربوط تحقیقی مطالعہ کر کے شخصیت ومقام اقبال کے صحیح فہم وادراک میں مدد حاصل کر سکیں، واللہ الموفق۔

عبقری مصر وعرب و اسلام، ادیب وشاعر وناقد، عباس محمود العقاد (1889ء۔ 1964ء،مصر) کی عربی زبان میں بکثرت اسلامی وادبی تصانیف نے عالم عرب واسلام کو وسیع پیمانے پر متاثر کیا ہے، مثلاً:

اَللّٰہ	أبو الانبیاء ابراھیمؑ	عبقریة موسیٰؑ
عبقریة المسیحؑ	عبقریة الرسولﷺ	عبقریة الصدیقؓ
عبقریة عمرؓ	عبقریة ذی النورینؓ	عبقریة الامام علیؓ
عبقریة خالدؓ	عائشة الصدیقةؓ	معاویة بن ابی سفیانؓ
عمرو بن العاصؓ	ابو الشھداء الامام الحسینؓ	الاسلام فی القرن العشرین

عقاد، علامہ اقبال کو بحیثیت ''مصور پاکستان'' خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

کانت الباکستان حکماً من أحلام إقبال منذ ربع قرن من الزمن، فأصبح الحلم الیوم دولة تضم بین جوانحها مائة ملیون من النفوس، یترجمون ذلک الحلم الرائع کل یوم إلی أعمال و آمال۔

وھکذا تکون العظمة التی تحییـنا ویحق علینا أن نتذکرھا بالتحیّة و الإحیاء، عظمة صوفی یعمل وعظمة عامل یتصوف۔

عظمة عالم یثیر النفوس بالآحلام ولیس بحالم فی منام أو قاعد محفل من الزحام۔

واذا وجب للعظماء حقھم فی کل زمن، واذا کان ھذا الحق أوجب مایکون علی الشرق فی ھذا الزمن، واذا نظرنا حولنا

نبحث عن مثال، المثال هو اقبال وذکری اقبال۔ (1)

ترجمہ: پاکستان ربع صدی سے اقبال کے خوابوں میں سے ایک خواب تھا۔ پس آج یہ خواب ایک ایسی مملکت کا روپ دھار چکا ہے جو دس کروڑ انسانوں پر محیط ہے۔ اور ہر روز ان کی اُمنگیں اور کارنامے اس خواب کی تعبیر پیش کرر ہے ہیں۔ یہی وہ عظمت انسانی ہے جو ہمارے لئے حیات بخش ہے۔ اور ہم پر لازم ہے کہ ہم اسے سلام پیش کرتے ہوئے اس کی یاد تازہ رکھیں۔

ایک ایسے صوفی کی عظمت جو میدان عمل میں ہے۔ اور ایک ایسے مردِ میدان کی عظمت جو صوفی ہے۔ ایک ایسے عالم کی عظمت جو خواب دکھا کر دلوں میں جوش وجذبہ اُبھارتا ہے۔ مگر اس کے خواب کسی سوئے ہوئے شخص کے خواب نہیں۔ اور نہ ہی وہ کسی بھری محفل میں بیٹھا خمار آلود ہے۔ اگر ہر دور میں عظیم لوگوں کا حق پہچاننا لازم ہے اور اگر یہ حق شناسی اس دور میں مشرق پر لازم تر ہے، اور ہم اپنے اردگرد اس عظمت کی مثال تلاش کرتے ہوئے نظر دوڑائیں، تو یہ مثال، اقبال ویاد اقبال کی صورت میں موجود ہے۔

نور بصارت سے محروم مگر نور بصیرت سے آراستہ نابغہ عرب ڈاکٹر طہٰ حسین (1889ء۔1973ء، مصر) کی عظیم الشان علمی ودینی وادبی تصانیف وخدمات نے عالم عرب واسلام ومغرب پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ مثلاً: علی هامش السيرة، الشيخان، الفتنة الكبرى، الوعد الحق، الأيام، مع أبي العلاء في سبحنه، في الأدب الجاهلي، وغیرہ۔

علامہ اقبال اور معروف عرب نابینا شاعر ابو العلاء المعری کا تعارف کراتے ہوئے طہ حسین رقمطراز ہیں۔

شاعران إسلاميان رفعا مجد الآداب الاسلامية إلى الذروة،

وفرضا هذا المجد الأدبي الاسلامي على الزمان، أحدهما إقبال، شاعر الهند والباكستان وثانيهما أبو العلاء، شاعر العرب". (2)

ترجمہ: "دو اسلامی شاعر ایسے ہیں جنہوں نے اسلامی ادبیات کی عظمت کو اوج کمال تک پہنچا دیا اور اس ادبی اسلامی عظمت کو زمانے سے منوالیا۔ ان میں سے ایک پاک و ہند کے شاعر اقبال ہیں اور دوسرے شاعر عرب، ابو العلاء المعری"۔

سابق مصری سفیر اور ممتاز محقق و ادیب، استاذ عبدالوہاب عزام نے اپنی محنت شاقہ سے کلام اقبال کے عربی تراجم پیش کر کے عالم عرب کو وسیع پیمانے پر اقبال سے روشناس کرایا ہے۔ عالم عرب پر ان کے اس احسان عظیم کا ذکر کرتے ہوئے طٰہٰ حسین یوں محوکلام ہیں:

"أفنى الأستاذ الصديق عبدالوهاب عزام وقتاً كبيراً وبذل جهداً عظيماً وقدّم الينا حياة اقبال وطائفة من شعر اقبال. وهو ماض في ترجمة ما بقي من شعره. فنحن مدينون له بكل مانعرفه عن اقبال باللغة العربية. وسيزداد هذا الدين شيئًا كلما أصاف إلى تراجمه التي بين أيدينا ترجمة أخرى. وأحب أن نكون أوفياء، وأن نكون كراماً على أنفسنا، وأول حقوق الكرامة هو أن نعرف الحق لأهله وأن نذكر إقبال أداء لما علينا جميعاً من دين. فهو الذى دعانا إلى الخير وأشاع فينا هذا الأمر بأن نعرف أنفسنا وحقوقنا ونجاهد في سبيل الحق والخير والجمال. (3)

ترجمہ: "ہمارے دوست استاذ عبدالوہاب عزام نے بہت سا وقت صرف کر کے

اور بڑی محنت ومشقت کے بعد ہمارے لئے اقبال کی زندگی نیز اقبال کی شاعری کا ایک حصہ عربی میں ترجمہ کرکے پیش فرمایا ہے اور وہ باقیماندہ کلام اقبال کا بھی ترجمہ کئے چلے جارہے ہیں۔ پس عربی زبان میں ہم اقبال کے بارے میں جتنے سرمائے سے واقف ہیں، اس کے لئے ہم عزام کے احسان مند ہیں اور جوں جوں وہ اپنے موجودہ تراجم اقبال میں مزید ترجموں کا اضافہ کرتے چلے جائیں گے، ہم پر ان کے قرض واحسان کا بوجھ بڑھتا جائے گا۔

میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنی ذات کے حوالہ سے باوفا وباعزت قرار پائیں۔ پس حقوق شرف وعزت میں سے اولین یہ ہے کہ ہم اہل حق کا حق پہچانیں اور اقبال کے اس قرض کو ادا کرنے کے لئے اس کی یاد منائیں جو ہم سب کے ذمے ہے، کیونکہ وہی ہے جس نے ہمیں خیر کی دعوت دی اور ہمارے درمیان اس امر کی اشاعت کی کہ ہم اپنی ذاتوں اور حقوق کو پہچانیں اور حق، خیر اور جمال کی راہ میں جہاد کریں۔

معروف مصری محقق ومؤرخ الاستاذ احمد حسن الزیات (مؤلف ''تاريخ الأدب العربي'' وغیرہ) عرب شاعر ابو العلاء المعری اور جرمن فلسفی شاعر ''نطشے'' جیسے اہل فکر وفلسفہ کے مقابلہ میں فلسفہ اقبال کی عظمت وانفرادیت ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وما كان إقبال إلا بضعة من طبيعة الهند المؤمنة نفخ فيها الاسلام من روحه، فصفت صفاء القطرة وخلصت خلوص الحق وسطعت سطوع الهدى، ثم تبلورت فيها برهمية الهند الموروثة ومحمدية العرب المكسوبة، فكان منهما فلسفة شعرية فريدة لاهي عدمية مترددة شاكية كفلسفة

المعرّي ولا هي وجودية ملحدة قاسية كفلسفة "نتشه" وأنما هي الاسلامية الموحدة المؤلفة السمحة كما أوحاها اللّه بروحيتها النابغة من القلب الشاعر بآلام الأرض وماديتها الصادرة عن العقل بإلهام السماء". (4)

ترجمہ: ''اقبال، ہند کی مؤمنانہ فطرت وطبیعت کا ایک ایسا جگر گوشہ تھے جس میں اِسلام نے اپنی روح پھونک دی۔ پس وہ قطرے کی طرح صاف شفاف اورحق خالص کی مانند خالص ہوکر نورِ ہدایت کی طرح چمکنے لگی۔ پھر اس میں ہند کی موروثی برہمیت اور عرب کی کسب شدہ محمدیت شفاف بلوری شکل اختیار کرگئی اور ان دونوں کے ملاپ سے ایک ایسا منفرد شعری فلسفہ وجود میں آیا جو نہ تو معرّی کے فلسفہ کی طرح عدمیت وتردد وتشکیک کا حامل تھا اور نہ ہی نطشے کے فلسفہ کی مانند متشددانہ ملحدانہ وجودی فلسفہ تھا، بلکہ وہ وحدت والفت وسماحت کا حامل ایک ایسا اسلامی فلسفہ ہے، جیسا کہ اللہ نے زمین کے آلام ومصائب کا شعور رکھنے والے دل سے جنم لینے والی روحانیت اور آسمانی الہام کے عقل وفہم سے وجود پذیر مادیت کے امتزاج سے وحی فرمایا ہو۔

استاذ زیّات، حسانؓ بن ثابت کو ''شاعر رسولؐ'' اور اقبال کو ''شاعر رسالت محمدیہ'' قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فإذا كان حسان شاعر الرسولؐ فكان إقبال شاعر الرسالة، و إذا كان لحسان من نازعه شرف الدفاع عن محمدؐ، فليس لإقبال من ينازعه شرف الدفاع عن المحمدية، وشتّان بين من يمجّد الداعي الأكبر عن عصبية ومن يمجّد الدعوة الكبرى عن عقيدة، واذا كان في الشعراء الصوفيين من عطر

مجالس الذكر بفضائل الاسلام و شمائل النبوة، فليس فيهم من بلغ مبلغ إقبال في فقه الشريعة وعلم الحقيقة والتأمل الفلسفي في كتاب اللّٰه والنظر العلمي في كلام الرسولؐ والجمع بين قديم الشرق وجديد الغرب في قوة تمييز وسلامة فهم وصحة حكم''۔ (6)

ترجمہ: ''اگر حسانؓ شاعر رسولؐ تھے، تو اقبال شاعر رسالت ہیں اور اگر حسانؓ کے شرف دفاع محمدؐ میں دیگر اصحابؓ بھی شریک تھے، تو اقبال کے شرف دفاع محمدیت میں کوئی ان کا ہمسر نہیں اور جو داعی اکبر کی عظمت عرب ہوتے ہوئے بیان کرے، تو اس میں اور اس شخص میں بڑا فرق ہے جو محض عقیدہ کی بناء پر دعوت کبریٰ کی عظمت سے گن گائے۔ نیز اگرچہ صوفی شعراء کے کلام میں فضائل اسلام اور شمائل نبوت سے بھرپور مجالس ذکر کا عطر ہے، مگر ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو قوت امتیاز، سلامتی فہم اور درستگی فیصلہ کی صفات کے ہمراہ شریعت کی سمجھ بوجھ، علم حقیقت، کتاب اللہ میں فلسفیانہ تدبر، کلام رسولؐ میں عالمانہ غور وفکر اور مشرق ومغرب کے قدیم وجدید کے امتزاج ویکجائی کے معاملہ میں اقبال کے مقام ومرتبہ تک پہنچ پایا ہو۔

ممتاز مصری محقق ومؤلف ڈاکٹر محمد حسین ہیکل (مؤلف سیرۃ الرسولؐ، ثانی اثنین ابو بکرؓ، عمر الفاروقؓ وغیرہ) جن کی عظیم الشان علمی وادبی تصانیف عالم عرب واسلام میں محتاج تعارف نہیں، اقبال کے فکر وفلسفہ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ومن حق اقبال أن يذكره في مثل هذا اليوم كل مسلم بل كل مفكر في الوجود، فقد طلع هذا الرجل على العالم الاسلامي وعلى العالم كله بفلسفة جديدة صاغها شعراً، فإذا هي تهزّ المشاعر والقلوب وإذا هي تثير كثيرين من

عظماء العالم فينظرون نظرات إعجاب إلى هذا المسلم الذي ولد في الهند ونشأ بين أهلها، ثم أعلن على الناس فلسفة شعرية سائغة لاتتفق مع الفلسفة الهندية في شيءٍ ويستحسن لذلک في حناياها عالم جديد و دولة جديدة۔ أما الدولة الجديدة فهي باكستان و أما العالم الجديد فهو عالم الاخاء الانساني في ظلال التوحيد و الايمان بالذات إيماناً تدفع فيه المحبة الى العمل و الدأب لإنشاء عوالم فكرية جديدة تزيدنا إقبالاً على الحياة وحرصاً على الخلق والإنشاء فيها''۔[6]

ترجمہ: ''اقبال کا یہ حق ہے کہ ایسے یوم (یوم اقبال) میں ہر وجود رکھنے والا مفکر اور مسلمان اس کا ذکر کرے، کیونکہ یہ شخص عالم اسلامی بلکہ پوری دُنیا میں ایک ایسے جدید فلسفہ کے ساتھ نمودار ہوا جسے اس نے شاعری میں ڈھالا اور پھر قلوب واذہان اور جذبات واحساسات کو جھنجوڑنے لگا۔ نیز اس کے فلسفہ نے دُنیا کے عظیم لوگوں کی کثیر تعداد کو ایسا جوش وجذبہ عطا کیا کہ وہ اس مسلمان کی طرف حیات بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے جو ہندوستان میں پیدا ہوا اور اسی کے باشندوں کے درمیان پروان چڑھا تھا، مگر پھر اس نے لوگوں کے سامنے ایک ایسے عمدہ شعری فلسفہ کا اعلان کیا جو کسی لحاظ سے بھی فلسفہ ہند سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اور جس کی پنہائیوں اور ادراک ونشو ونما کے لئے ایک جدید دُنیا اور جدید ریاست ہی مستحسن تھی۔ پس وہ جدید ریاست تو ''پاکستان'' ہے اور ''جدید دُنیا'' توحید و ایمان بالذات کے سائے تلے قائم عالم اخوت انسانی ہے، ایسا ایمان بالذات جس میں محبت

ہی اس جہد وعمل کا محرک اصلی ہو کہ جس کا مقصد ایسی جدید فکری دُنیاؤں کا
قیام ہے جو زندگی کی جانب پیش قدمی میں اضافہ کریں اور ہمیں تخلیق و
انشاء کے سلسلہ میں حریص تر بنادیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ بیس سے زائد ممالک اور تیس کروڑ سے زائد افراد پر محیط عالم عرب کے اقبال شناس علماء و دانشوران نیز متاثرین اقبال کی فہرست طویل تر ہے، جن میں عالم عرب کے نمایاں ترین علماء وفضلاء وشعراء وادباء شامل ہیں، مثلاً استاذ عباس محمود العقاد، دکتور طہٰ حسین، دکتور عبدالوہاب عزام، دکتور محمد حسین ہیکل، استاذ احمد حسن زیات، دکتور حسین مجیب المصری، دکتور محمد کامل موسیٰ، استاذ فتحی رضوان، دکتور سلیمان حزین، دکتور عثمان امین، دکتور احمد شرباصی، دکتور حسن عیسیٰ عبدالظاہر، دکتور عبدالمعطی بیومی، دکتور عبدالودود شلبی، دکتور سمیر عبدالحمید ابراہیم، شیخ صاوی علی شعلان، دکتور ابراہیم ناجی، دکتور سعد ظلام، استاذ محمود جبر، استاذ محمد مصطفیٰ حمام، استاذ محمد عبدالمنعم ضیف اللہ، استاذ خالد جرنوسی، عزیز اباضہ پاشا، محمد عبدالغنی حسن، عبدالرحمٰن عزمی، عبداللہ شمس الدین، محمود حسن اسماعیل وغیرھم۔[7]

''قائد انقلاب ایران سید روح اللہ خمینی (1902ء - 1989ء) کے دست راست اور جلیل القدر ایرانی عالم ومؤلف سید مرتضیٰ مطہری (م 1979ء، تہران) سنی العقیدہ اقبال کو اپنے مخصوص مذہبی پس منظر میں یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

> ''اگر چہ اقبال رسمی طور پر سنی مذہب رکھتا تھا، لیکن وہ محمدؐ اور اہل بیتؑ کے ساتھ بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے ان کی شان میں ایسی انقلابی اور تعلیمی نظمیں لکھیں کہ جو تمام شیعہ شعراء کی فارسی زبان میں شائع شدہ کتابوں میں نہیں ملتیں، تاہم اقبال کا مطمحِ نظر شاعری کرنا نہیں تھا، اس کو اس نے صرف مسلم سوسائٹی کو بیدار کرنے کے لئے استعمال کیا''۔[8]

جانشین خمینی و رہبر انقلاب ایران سید علی خامنہ ای جنہیں کلام اقبال کا کثیر حصہ زبانی یاد

ہے، اپنے عظیم الشان مقام و مرتبہ کے باوجود اقبال سے منفرد انداز میں اظہار عقیدت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مثل کسی که سالها مرید اقبال بوده،

ودر ذهن خود با اقبال زیسته است''۔[9]

ترجمہ: میری مثال اس شخص کی سی ہے جو برسوں اقبال کا ارادت مند رہا ہو اور جس نے فکری طور پر اقبال کے ہمراہ زندگی بسر کی ہو۔

مفکر ایران ڈاکٹر علی شریعتی (1933ء-1977ء) جن کی شخصیت و افکار نیز دو سو سے زائد خطبات و تصانیف نے لاکھوں جدید تعلیم یافتہ شیعان ایران کو متاثر کیا، علامہ اقبال کے ایرانی مداحین میں سرفہرست ہیں۔ اقبال کے بارے میں آپ کے مختلف خطبات اور لیکچرز ایک مستقل تصنیف ''ما و اقبال'' کی صورت میں محفوظ و مقبول ہیں۔ اس اہم تصنیف کے مختلف اقتباسات اقبال کی شخصیت و فکر و کلام کی تعظیم و تجلیل کے سلسلہ میں اہل ایران کے جذبات و تاثرات کی ترجمانی کے سلسلہ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ علی شریعتی، اقبال کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

فیلسوف، سیاستمدار، مجاهد، محقق، عارف، اسلام شناس، شاعر و صاحب فرهنگ غربی و شرقی۔[10]

ترجمہ: فلسفی، سیاستدان، مجاہد، محقق، صاحب معرفت، اسلام شناس، شاعر اور تہذیب مغرب و مشرق کا حامل۔

دکتر علی شریعتی مزید رقمطراز ہیں:

''اقبال مرد دین و دُنیا، ایمان و دانش، عقل و احساس، فلسفه و ادب، عرفان و سیاست، خدا و مردم، پرستش و جهاد، عقیدت و فرهنگ مردِ دیروز، پارسای شب و شیر روز بود''۔[11]

ترجمہ: اقبال مرد دین و دُنیا، ایمان و دانش، عقل و احساس، فلسفہ و ادب، معرفت و سیاست، مرد خدا و انسان تھا۔ اقبال مرد جہاد و عبادت، عقیدہ و ثقافت، ماضی و حال تھا۔ اقبال دن کو مرد میدان اور شب کو عبادت گزار تھا۔

شخصیت اقبال کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے شریعتی فرماتے ہیں:

''اقبال هم مرد تفکر فلسفی است، وهم مرد تفکر علمی، هنم عالی ترین تحصیلات امروز دنیا را دارد، وهم مرد سیاست و اندیشیدن بسر نوشت جامعه است. مرد عمل است، مرد مبارزه است، مرد شعر است، ادب است، سخن است. مرد قبول تعهد های سنگین در برابر جامعه خودش است. و مروی است که درهمه ابعاد گونان گون عالی ترین تجلی را داشته. شاعر، فیلسوف، مبارز فکری، مجاهد بیدار سیاسی، اهل خلوت و دعا و تامل های روحی، اهل مبارزه اجتماعی، اهل مبارزه علیه استعمار، اهل بیداری فکری جامعه، اهل احیای فرهنگ و ایمان اسلامی، اهل سخن و ادب است، یعنی مسلمان است.

این آدم خطرناک است هم برای استعمار خارجی وهم برای استعمار داخلی، چرا؟ برای اینکه کسانیکه ازجهل مردم واز خواب مردم، واز تعصب های تنگ نظرانه بینش عوام تغذیه میکنند، بزرگترین دشمنشان، دشمنشان رویا روی اسلام نیستند، دشمن این ها استعمار نیست، دشمن این ها کفر نیست، که کفر و استعمار پشتوانه این ها

است، دشمن اینها مسلمانان بیدار کننده و راستین و درستند، اقبال هامی توانند عوامل ارتجاعی را نابود کنند. اقبال هامی توانند مسلمانانرا بیدار کنند''۔ (12)

ترجمہ: ''اقبال فلسفیانہ سوچ کا بھی حامل ہے اور علمی فکر بھی رکھتا ہے۔ نیز اس کے پاس عصر جدید کے علوم وسندات بھی ہیں۔ وہ مرد سیاست اور معاشرے کی تقدیر پر غور وفکر کرنے والا بھی ہے اور مرد عمل ومرد میدان بھی۔ وہ مرد شعر وسخن بھی ہے اور اپنے معاشرے کی جانب سے عائد شدہ بھاری ذمہ داریوں کو قبول کرنے والا بھی۔ وہ ایک ایسا فرد ہے جو تمام مختلف النوع اطراف و موضوعات پر اعلیٰ ترین تجلی وروشنی کا حامل ہے۔

اقبال، شاعر، فلسفی، فکری محاذ پر جنگ آزما نیز بیدار مغز سیاسی مجاہد ہے۔ وہ صاحب خلوت ودُعا نیز صاحب غور وفکر روحانی ہے۔ وہ معاشرتی میدان میں برسر پیکار، سامراج کے خلاف برسر جنگ، معاشرے کی فکری بیداری کا علمبردار، تجدید ایمان اور احیاء تہذیب اسلامی کا نقیب، صاحب ادب و کلام ہے، یعنی مسلمان ہے۔

یہ شخص نہ صرف غیر ملکی سامراج کے لئے بلکہ داخلی استعمار کے لئے بھی خطرناک ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ لوگ جو عوام کی غفلت و جہالت اور تنگ نظرانہ تعصبات پر مبنی کوتاہ اندیشی کو غذا فراہم کرتے ہیں، ان کے اصل دشمن وہ دشمنان اسلام نہیں ہیں جو بظاہر مدمقابل نظر آتے ہیں۔ ان کا اصل دشمن تو وہ بیداری پیدا کرنے والے مسلمان ہیں جو راست باز اور صراط مستقیم پر چلنے والے ہیں۔ صرف اقبال جیسے حضرات ہی رجعت پسند اور ردعمل کی پیداوار عناصر اور ایجنٹوں کو نیست و نابود

کر سکتے ہیں۔ اقبال جیسے افرادہی مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کر سکتے ہیں۔

دکتر علی شریعتی، علامہ اقبال کو اپنے مذہبی آئیڈیل سیدنا علیؑ سے قریب تر پاتے ہیں:

''من وقتی به اقبال می اندیشم "علی گونه" را می بینم، انسانی را بر گونه علی، امام بر اندازه های کمی و کیفی متناسب با استعداد های بشری قرن بیستم". (13)

ترجمہ: ''جب میں اقبال کے بارے میں غور کرتا ہوں تو وہ مجھے 'طرزِ علی' کا حامل نظر آتا ہے۔ علیؑ کی طرز کا انسان، ایسا قائد جو کیفیت و کمیت کے لحاظ سے بیسویں صدی کی بشری صلاحیتوں اور تقاضوں سے مطابقت رکھتا ہے''۔

ڈاکٹر علی شریعتی بحیثیت شیعہ بھی اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''سنی اقبال'' جیسا مداح اہل بیتؑ خود شیعہ شعراء میں بھی موجود نہیں:

''از میان همه شعرای امروز شیعی، بزرگترین اثر، عالی ترین اثر، هم از لحاظ فکر، هم از لحاظ شدت اخلاص، هم از لحاظ منطق، هم از لحاظ اثر ادبی، دیوان و شعر اقبال است. دربارهٔ خانواده پیغمبر اخلاص او همین بس که در جامعه سنی مذهب است و ستایش گر خاندان پیغمبر در اُردو زبان است، و سرایندهٔ بهترین مدح ها درباره ائمه شیعه به فارسی". (14)

ترجمہ: ''عصر جدید کے تمام شیعہ شعراء کے درمیان فکری لحاظ سے بھی اور شدت اخلاص کے لحاظ سے بھی، نیز منطق کے لحاظ سے بھی اور تاثیر ادبی کے لحاظ سے بھی، عظیم ترین اور اعلیٰ ترین شاہکار اقبال کی شاعری اور اس کا دیوان

ہے۔ خاندان پیغمبرؐ کے بارے میں اس کے اخلاص کی یہی دلیل کافی ہے
کہ وہ ایک سنی العقیدہ معاشرے کافرد ہے اور اُردو زبان میں خاندان پیغمبرؐ
کا مدح خوان نیز فارسی زبان میں ائمہ شیعہ کے بارے میں بہترین مدح
سرائی کرنے والا ہے''۔

اعتقادی حوالہ سے اقبال 17 اکتوبر 1935ء کو اپنی یادداشت کی کتاب میں خصوصی طور پر فرزند ارجمند جاوید اقبال سے خطاب کرتے ہوئے اپنی وصیت کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

غرض یہ ہے کہ طریقہ حضرات اہل سنت محفوظ ہے اور اسی پر گامزن
رہنا چاہئے اور ائمہ اہل بیتؓ کے ساتھ محبت اور عقیدت رکھنی چاہئے۔[15]

عالی مرتبت اقبال شناس ایرانی علماء و دانشوران کا تذکرہ کرتے ہوئے ماہر اقبالیات اور نامور محقق ومؤلف واستاذ فارسی، ڈاکٹر سید محمد اکرم اختصار وجامعیت کے ساتھ فرماتے ہیں:

''استاد سعید نفیسی، استاد ذبیح اللہ صفا، فخر دائی گیلانی، مجتبٰی مینوی، احمد
منزوی، دکتر شفیعی کدکنی، سید غلام رضا سعیدی، فخر الدین حجازی، گل چین
معانی، احمد سروش، دکتر سید کمال، حاجی سید جوادی، دکتر فرجاد، دکتر اسلامی
ندوشن، ضیاءپور، دکتر محمد حسین تسبیحی، دکتر شہبندخت کامران مقدم، دکتر
ابو القاسم رادفر، دکتر علی شریعتی اور رہبر ایران سید علی خامنہ ای۔ وہ بلند پایہ
اقبال شناس ہونے کے ساتھ ساتھ برصغیر میں اسلامی تہذیب کے ارتقاء
پر عمیق نظر رکھتے ہیں''۔[16]

ایران کی طرح افغانستان و وسط ایشیا میں بھی قائد ''تحریک اسلامی'' افغانستان مولانا منہاج الدین شہید سے لے کر شاعر جہاد افغانستان استاد خلیل اللہ خلیلی تک ہزاروں علماء ومحققین و اساتذہ ومجاہدین کے افکار و اشعار ومجاہدات میں اس اقبال دردمند وحق اندیش کی جھلک نظر آتی ہے، جس نے کابل کو مفتوحہ دہلی سے بدرجہا بدتر قرار دیا، بقول ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام:

"تاریخ شاهد است که ملت افغان باوجود وسائل محدود و
شرائط سخت جغرافیائی، آزادی و استقال خویش رابه هیچ
وجه از دست نداد و هر گز محکوم و مستعمره دیگران نشد.
علامه اقبال به همیں سبب برادران افغان را همیشه ستوده،
و شهر کابل را بر دهلی ترجیح داده میگوید:

هزار مرتبه کابل نکوتر از دلی است
که ایں عجوزه عروس هزار داماد است[17]

ترجمہ: تاریخ شاہد ہے کہ افغان قوم نے محدود وسائل اور سخت جغرافیائی حدود و قیود کے باوجود کسی بھی قیمت پر اپنی آزادی واستقلال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اسی وجہ سے علامہ اقبال نے افغان قوم کی ہمیشہ تعریف کی ہے اور شہر کابل کو دہلی پر ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہزار مرتبہ کابل نکوتر از دلی است   کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است

کابل دلی سے ہزار گنا بہتر ہے۔ کیونکہ یہ بڑھیا (دہلی) تو ہزار شوہروں کی دُلہن ہے۔ (یعنی دہلی کو تو لاتعداد فاتحین نے فتح کیا ہے، جبکہ کابل نے کبھی اغیار کی محکومی قبول نہیں کی)

برصغیر کے عالمی شہرت یافتہ عالم دین، مفکر ومؤلف اسلامی، نادر المثال ادیب عربی، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، رئیس "ندوۃ العلماء" لکھنؤ (م 31 دسمبر 1999ء، رائے بریلی، ہند) کی لاتعداد عربی اور اُردو تصانیف وخطبات وتراجم، عالم عرب واسلام ومشرق ومغرب میں مقبول ومعتبر ہیں، مثلاً: ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، من نهر کابول إلی نهر الیرموک، الصراع الفکری میں الحضارة العربیة والاسلامیة فی الأقطار الاسلامیة، رجال الفکر والدعوة، تاریخ دعوت وعزیمت، وغیرہ۔

آپ کی عربی تصنیف "روائع إقبال" (اردو ترجمہ بعنوان "نقوشِ اقبال") نے اقبال کو دُنیائے عرب میں کماحقہ متعارف کرانے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔ 17 رمضان

1356ھ/ 22 نومبر 1937ء کو اپنے پھوپھا سید طلحہ حسنی (سابق استاد اورینٹل کالج، لاہور، متوفی 22 رجب 1390ھ/25 ستمبر 1970ء، کراچی) اور برادر عزیز مولوی سید ابراہیم حسنی کے ہمراہ لاہور میں اقبال کے دولت کدے پر ان سے تفصیلی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے علی میاں بیش قیمت افکار اقبال نقل و روایت فرماتے ہیں:

''اس صحبت میں ہر طرح کے موضوعات زیر بحث آتے رہے۔ سلسلہ گفتگو میں شعر جاہلیت کا ذکر آیا تو اقبال نے اس کی صداقت و واقعیت، اس کے جوش و خروش کا پسندیدگی کے ساتھ ذکر کیا اور ''حماسہ'' کے بعض اشعار پڑھے۔

وہ کہنے لگے کہ اسلام اپنے پیروؤں میں عملیت اور حقیقت پسندی پیدا کرتا ہے اور ادھر آج کی سائنس بھی حقیقت پسندی اور تخیلات سے گریز میں اسلام سے قریب نظر آتی ہے۔ اسلام کی دو صدیوں میں مسلمانوں میں یہ روح زندہ رہی جس کے نتیجے میں وہ عقیدہ و عمل، سیرت و اخلاق کے جادۂ استوار پر گامزن رہے، لیکن یونانی فلسفہ الہیات نے مشرق کو مرد بیمار اور بیکار بنادیا۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ بھی اسی وقت ہوئی، جب اس نے اپنے کندھوں سے فلسفہ مابعد الطبیعات کا جوا اتار پھینکا اور مفید، نتیجہ خیز علوم کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن اس عہد میں وہ مسائل پیدا ہونے لگے جنہوں نے یورپ کو بھی رجعت پسندی کی لائن پر ڈال دیا۔ انہوں نے کہا کہ عربی مزاج اسلام کے کے لئے بہت سازگار ثابت ہوا، لیکن عجمی تخیلات نے اسلام پر وہی ظلم کیا جو کلیسا نے یورپ پر کیا تھا۔ مجموعی طور پر آریائی فکر نے دونوں مذہبوں کو کم و بیش اپنی گرفت میں لے لیا۔

آپ نے تصوف کے ذکر میں بعض صوفیہ کے فکری غلو پر تنقید کی اور وحدو

سماع کے بارے میں کہنے لگے کہ صحابہ کرامؓ کو بجائے ان خیال آرائیوں کے شہسواری اور جان سپاری میں طرب و اہتزاز اور راحت و مسرت محسوس ہوتی تھی۔

ہندوستان میں اسلام کی تجدید و احیاء کی بات نکلی تو شیخ احمد سرہندیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سلطان محی الدین عالمگیرؒ کی بڑی تعریف کی اور فرمایا کہ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ اگر ان کا وجود اور ان کی جدوجہد نہ ہوتی تو ہندوستانی تہذیب اور فلسفہ، اسلام کو نگل جاتا۔

پاکستان کے بارے میں فرمایا کہ جو قوم اپنا ملک نہیں رکھتی، وہ اپنے مذہب وتہذیب کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ دین وتہذیب، حکومت وشوکت ہی سے زندہ رہتے ہیں۔ اس لئے پاکستان ہی مسلم مسائل کا واحد حل ہے اور یہی اقتصادی مشکلات کا حل بھی ہے۔ ضمناً انہوں نے اسلام کے نظام زکوٰۃ اور بیت المال کا بھی ذکر کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں فرمایا کہ میں نے بعض مسلم والیان ریاست وحکومت کو غیر مسلموں میں تبلیغ کی طرف توجہ دلائی اور مسلمانوں میں بھی دعوت کے کام پر زور دیا اور عربی زبان کی ترقی اور ایک عالمی بنک کے قیام کے بارے میں بھی بات چیت کی، میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے معاملات کی وکالت کے لئے ایک بلند پایہ انگریزی اخبار بھی ضروری ہے، جس سے ملت کی آواز میں طاقت اور اثر پیدا ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلم والیان ریاست نے مسئلے کی اہمیت نہیں سمجھی اور نہ انہیں خطرات کا احساس ہوا۔

ان کی تنگ نظری، پست خیالی اور خودغرضی کے وہ بہت شاکی تھے''۔ (18)

مولانا سید ابوالحسن ندویؒ (11 محرم 1333ھ۔ 22 رمضان 1420ھ/ جنوری 1914ء۔ 31 دسمبر 1999ء، رائے بریلی، یوپی، ہند) خدمات اقبالؒ کے حوالہ سے رقمطراز ہیں۔

"بانگِ درا، سن 1924ء میں منظر عام پر آئی اور جب سے اب تک اردو کے افق پر اس کا ستارہ غروب نہیں ہوا، نہ اس کی آواز صدائے صحرا۔ اس کی اشاعت کے بعد کا دوران کی وفات تک فکری پختگی اور دائرہ علم کی وسعت وبیکرانی کے لئے مشہور ہے۔ اسی دور میں ان کے نصب العین اور دعوت و پیغام میں وضاحت اور قطعیت پیدا ہوئی اور ان کے فارسی مجموعہ کلام سامنے آئے۔

انہوں نے فارسی کو اپنے اظہار خیال کے لئے اس لئے ترجیح دی کہ اُردو کے مقابلے میں اس کا دائرہ وسیع تھا اور عربی کے بعد عالم اسلامی کی وہ دوسری زبان کا درجہ رکھتی تھی، ایران و افغانستان کی تو وہ مادری زبان ہی تھی اور اب بھی ہندو بیرون ہند میں اس کے ذوق آشنا بہت ہیں اور اس کا اثر ترکستان، روس اور ترکی تک پھیلا ہوا ہے۔

اس دور میں ان کے اُردو مجموعوں کے علاوہ فارسی میں "اسرار خودی" و "رموز بیخودی" "پیام مشرق"، "زبور عجم"، "جاوید نامه"، "پس چه باید کرد، مسافر" شائع ہوئیں۔ مدراس لیکچرز (تشکیل جدید الٰهیات اسلامیه) اور کیمبرج کے لیکچر اس کے بعد شائع ہوئے۔ جن پر اہل ادب اور ارباب مذہب وفلسفہ نے یکساں طور پر توجہ کی اور ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور متعدد زبانوں میں ان کا ترجمہ ہوا نکلسن نے "اسرار، رموز" کا انگریزی ترجمہ کیا اور جرمنی و

اطالیہ میں ان کے شعر و پیام پر غور وفکر کے لئے ان کے نام سے اکیڈیمیاں قائم ہوئیں۔

1930ء میں الہ آباد میں ''مسلم لیگ'' کے اجلاس کے خطبہ صدارت میں انہوں نے پہلی بار پاکستان کا نظریہ پیش کیا۔اور پنجاب کی ''مجالس قانون ساز'' کے ممبر منتخب ہوئے اور 31-1930ء کی گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کی نمائندگی کی۔

لندن میں انہیں فرانس، اسپین اور اٹلی کی حکومتوں نے ملکی دورے کی دعوت دی۔ چنانچہ آپ مؤخر الذکر دونوں ملکوں کی دعوت پر گئے اور میڈریڈ میں ''اسلامی آرٹ'' پر چند خطبات دیئے۔مسلمانوں کی صدیوں کی جلا وطنی کے بعد مسجد قرطبہ میں پہلی بار نماز پڑھی اور عربوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کے اقبال رفتہ کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو روئے اور دل کے پھپھولے پھوڑے۔اقبال نے اپنی نظم میں اپنے احساسات اور سچے جذبات کا ایسا نقش کھینچا ہے،جس میں اسلامی اندلس کی تہذیبی روح اور اس کے ماضی کا عطر کھنچ آیا ہے''۔(19)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اسی تسلسل میں اقبال کی یورپ میں مصروفیات نیز سفر بیت المقدس وافغانستان کا تذکرہ کرتے ہوئے مزید رقم طراز ہیں:

''اسپین میں اقبال کا پرجوش استقبال ہوا تھا، اسی طرح اٹلی میں بھی موسولینی نے بھی ان کی پذیرائی کی جو ان کی کتابیں پڑھے ہوئے اور ان کے فلسفہ سے واقف تھا،اس لئے دیر تک آپس میں گفتگو ہوتی رہی۔

حکومت فرانس نے ان کو شمالی افریقہ کے مستعمرات کی سیر اور پیرس کی مسجد آنے کی دعوت دی،لیکن غیرت مند مسلمان شاعر نے دعوت کو یہ کہہ کر ٹھکرادیا

کہ "یہ تو دمشق کی دردناک تباہی کی حقیر قیمت ہے"۔
یورپ کے دوران قیام ان کے دوستوں اور قدردانوں نے کیمبرج، روم، سوربون، مڈریڈ یونیورسٹی اور "رومن رائل سوسائٹی" نے ان کے اعزاز میں جلسے کئے۔ واپسی میں آپ بیت المقدس کی "مؤتمر اسلامی" میں شریک ہوئے اور اثنائے راہ میں اپنی پر اثر نظم "ذوق وشوق" کہی۔
1932ء میں شاہ نادر خان شہیدؒ کی دعوت پر اس علمی وفد کے ساتھ افغانستان گئے، جس میں سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی شریک تھے۔ بادشاہ نے بہت اخلاص کے ساتھ رازدارانہ گفتگو کی اور اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ دیر تک گفتگو کرتے اور روتے رہے۔ سلطان محمود غزنویؒ اور حکیم سنائی کے مزار پر پہنچ کر ان کا جذبہ بے اختیار پھر اشک حسرت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس نے نظم کا لباس پہنا۔ اس سفر کے تاثرات "مسافر" میں جھلکتے ہیں"۔[20]

وفات اقبال کی تصویر کشی کرتے ہوئے ابوالحسن ندویؒ رقم طراز ہیں:
"اقبال عرصے سے طرح طرح کے امراض وعوارض کا شکار چلے آرہے تھے۔ بالآخر ان کی صحت نے جواب دیدیا اور وہ صاحب فراش ہوگئے۔ لیکن اس حال میں بھی شعر گوئی، تصانیف اور ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان دنوں کے مشاغل میں قومیت کے نظریہ کی تردید ان کی تحریروں کا بہت نمایاں حصہ ہے۔ انہی دنوں آپ نے یہ قطعہ کہا تھا۔

بهشتے بهر پاکان حرم است
بهشتے بهر ارباب همم است
بگو هندی مسلمان را که خوش باش
بهشتے فی سبیل الله هم است

اور اپنی وفات سے دس منٹ پہلے وہ قطعہ کہا جوشوق وحسرت کا بیان اور ان کی زندگی کا ترجمان ہے:

سرودے رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اور پھر اپنا آخری لافانی شعر پڑھا:

نشان مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

یہ آخری دلیل تھی جو انہوں نے صداقت اسلام اور مومن کے ایمان ویقین پر قائم کی۔ اور اپنے بوڑھے وفادار خادم کی گود میں آخری سانس لی۔ اور عالم اسلامی میں پھیلے ہوئے دوستوں، شاگردوں اور قدردانوں سے منہ موڑ کر اور ان کو سوگوار چھوڑ کر، دین وادب کا آفتاب عظمت واقبال جس نے دلوں کو حرکت وحرارت، روشنی اور گرمی عطا کی تھی، 21 اپریل 1938ء کا آفتاب نکلنے سے پہلے غروب ہوگیا''۔[21]

مفکر اسلام مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ (1903ء۔1979ء، مدفون لاہور) جن کی شہرہ آفاق تفسیر، ''تفہیم القرآن'' اور سو سے زائد علمی و دینی تصانیف نیز ''تحریک اسلامی'' نے برصغیر وعالم عرب واسلام کے لاکھوں مسلمانوں کو متاثر کیا ہے، علامہ اقبال کی وفات (21 اپریل 1938ء، لاہور) کے بعد ایک تفصیلی مضمون (مطبوعہ ''جوہر'' دہلی) میں یوں رقمطراز ہیں:

اقبال کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ فقط اعتقادی مسلمان تھے، عمل سے ان کو کچھ سروکار نہ تھا۔ اس بدگمانی کے پیدا کرنے میں خود ان کی افتادِ طبع کا بھی کچھ دخل ہے۔ ان میں کچھ فرقہ ملامتیہ کے سے میلانات تھے جن کی بناء پر اپنی رندی کے اشتہار دینے میں انہیں کچھ مزہ آتا تھا، ورنہ درحقیقت وہ اتنے بے عمل نہ تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت سے ان کو خاصا شغف تھا اور صبح کے وقت بڑی خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، مگر اخیر زمانہ میں طبیعت کی رقت کا یہ حال ہوگیا تھا کہ تلاوت کے دوران روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں اور مسلسل پڑھ ہی نہ سکتے تھے۔ نماز بھی بڑے خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے، مگر چھپ کر۔ ظاہر میں یہی اعلان تھا کہ بڑا گفتار کا غازی ہوں''۔[22]

اقبال کے تعلق بالقرآن کے حوالہ سے سید مودودی فرماتے ہیں:

''مغربی تعلیم وتہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہ میں جب پہنچا تو دُنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہا، وہ جو کچھ سوچتا تھا، قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا، قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا، حقیقت اور قرآن اس کے نزدیک شے واحد تھے اور اس شے واحد میں وہ اس طرح فنا ہوگیا تھا کہ اس دور کے علماء دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو فنائیت فی القرآن میں اس امام فلسفہ اور اس ایم اے، پی ایچ ڈی، بار ایٹ لاء سے لگا کھاتا ہو۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آخری دور میں اقبال نے تمام کتابوں کو الگ کر دیا تھا اور سوائے قرآن نے کوئی کتاب وہ اپنے سامنے نہ رکھتے تھے۔ سالہا سال تک علوم وفنون کے دفتروں میں غرق رہنے کے بعد جس نتیجے پر پہنچے تھے، وہ یہ تھا کہ اصل علم قرآن ہے۔ اور یہ جس کے ہاتھ آجائے، وہ دُنیا کی تمام کتابوں سے بے نیاز ہے''۔[23]

اقبال کی شدت ایمان بالحدیث کے حوالہ سے سید مودودی بیان فرماتے ہیں:

''حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں، پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے ہیں اور پہلو بدل بدل کرتا ویلیں کرنے لگتے ہیں، یہ ڈاکٹر آف فلاسفی ان کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا۔ اور ایسی کوئی حدیث سن کر ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے دل میں شک کا گزر نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا جس میں بیان ہوا ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب ثلاثہؓ کے ساتھ کوہ اُحد پر تشریف رکھتے تھے۔ اتنے میں احد لرزنے لگا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

ٹھہر جا تیرے اُوپر ایک نبی، ایک صدّیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔

اس پر پہاڑ ساکن ہو گیا۔

اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا: اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے؟ میں اس کو استعارہ ومجاز نہیں بلکہ ایک مادی حقیقت سمجھتا ہوں۔ اور میرے نزدیک اس کے لئے کسی تاویل کی حاجت نہیں۔ اگر تم حقائق سے آگاہ ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ایک نبی کے نیچے آکر مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز اُٹھتے ہیں، مجازی طور پر نہیں، واقعی لرز اُٹھتے ہیں''۔[24]

اقبال کی نظر میں مقام شریعت و احکام شریعت کی مثال دیتے ہوئے مولانا مودودی رقمطراز ہیں:

''اسلامی شریعت کے جن احکام کو بہت سے روشن خیال حضرات فرسودہ اور بوسیدہ قوانین سمجھتے ہیں اور جن پر اعتقاد رکھنا ان کے نزدیک ایسی تاریک خیالی ہے کہ مہذب سوسائٹی میں اس کی تائید کرنا ایک تعلیم یافتہ آدمی کے لئے ڈوب مرنے سے زیادہ بدتر ہے، اقبال نہ صرف ان کو مانتا اور ان پر عمل کرتا تھا، بلکہ برملا ان کی حمایت کرتا تھا۔ اور اس کو کسی کے سامنے ان کی تائید کرنے میں باک نہ تھا، اس کی ایک معمولی مثال سن لیجئے:

ایک مرتبہ حکومت ہند نے ان کو جنوبی افریقہ میں اپنا ایجنٹ بنا کر بھیجنا چاہا اور یہ عہدہ ان کے سامنے پیش کیا، مگر شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو پردہ نہ کرائیں گے اور سرکاری تقریبات میں لیڈی اقبال کو ساتھ لے کر شریک ہوا کریں گے۔ اقبال نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور خود لارڈ ولنگڈن سے کہا کہ میں بے شک ایک گنہگار آدمی ہوں، احکام اسلامی کی پابندی میں بہت کوتاہیاں مجھ سے ہوتی ہیں، مگر اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا کہ محض آپ کا ایک عہدہ حاصل کرنے کے لئے شریعت کے حکم کو توڑ دوں''۔ (25)

برصغیر کے جلیل القدر ماہر تعلیم و محقق، ادیب و نقاد، پروفیسر رشید احمد صدیقی (سابق وائس چانسلر، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، ہند) اختصار و جامعیت کے ساتھ اقبال کے بارے میں یوں محو کلام ہیں:

''اقبال کا کلام ہمارے لئے اس صدی کا علم کلام ہے جو ایک نامعلوم

اور طویل مدت تک تازہ کار رہے گا، اس لئے کہ وہ ایک عظیم شاعری میں ڈھل چکا ہے۔ اسلامی عقائد، شعائر اور روایات کی جس عالمانہ، عارفانہ اور شاعرانہ انداز سے اپنے بے مثل کلام میں اقبال نے وکالت کی ہے، اس سے مسلم معاشرہ حیرت انگیز طور پر متاثر ہوا ہے۔ ایسی صحت مند اور بامقصد بیداری کا امتیاز شاید ہی کسی اور عہد کے علم کلام کے حصہ میں آیا ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہبی کتب کے براہِ راست مطالعہ سے بعض طبائع اور اذہان اتنے متاثر نہیں ہوتے، جتنا ان حقائق کو اقبال کے کلام میں مطالعہ کر کے مطمئن ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اقبال کے مشہور لیکچرز ''اسلام کی تشکیل نو'' میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان کو جہاں تہاں تسلیم کرنے میں اکثر علماء کو تامل ہوا ہے، لیکن انہی حقائق کو اقبال کی شاعری میں سن یا پڑھ کر بے ساختہ قائل ہو جاتے ہیں، اس طرح جیسے وہ تمام نکتے اپنے تمام معارف و بصائر کے ساتھ براہِ راست ان پر منکشف ہو گئے ہوں''۔(26)

خلاصہ و نتیجہ کلام اکابر عرب و عجم بحوالہ اقبالؒ

عرب و عجم میں مقام اقبالؒ کے حوالہ سے درج شدہ اقوال و تفاصیل و دیگر متعلقہ معلومات سے درج ذیل خلاصہ و نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے:

-1 اقبال، قرآن و سنت و شریعت، اجماع صحابہؓ و عقائدؒ اہل سنت والجماعت پر ایمان کامل رکھنے والا ایک سنی العقیدہ مسلمان ہے جس نے سیدنا ابو بکر و عمر و عثمان و علی نیز دیگر صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ساتھ سیدہ فاطمہؓ و دیگر اہل بیت نبیؐ و علیؓ کے بارے میں بھی ایسی شاندار نظمیں اور اشعار کہے ہیں جن کی مثال خود شعرائے اہل تشیع کے ہاں بھی مفقود و معدوم اور عقیدت و مدح اہل بیتؓ میں اقبال کی عظمت و برتری کی روشن دلیل ہے۔

-2 اقبال کی حیات مستعار کا مرکز و محور مطالعہ قرآن و عشق رسولؐ ہے اور وہ تقویٰ کا دعویدار نہ ہوتے ہوئے، نیز نمائش عبادت سے اجتناب کے باوجود، نماز و قرآن سے شغف رکھنے والا عظیم مسلمان ہے۔

-3 اقبال، جملہ انبیاء و مرسلینؑ، صحابہؓ و تابعینؒ، اولیاء و صالحینؒ اور امراء و مجاہدین اسلام کا عقیدت مند و خوشہ چین ہے۔ وہ ''مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ۔ مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ'' کا قائل، کارزار حیات میں مصروف جہاد، اسلامی تصوف و روحانیت کا مؤید و ہمنوا، فلسفہ خودی کا ترجمان اور وحدت اُمت و اتحاد عالم اسلام کا حدی خواں نیز تجدید دین و احیائے خلافت کا علمبردار ہے۔

-4 اقبال عربی، فارسی، اُردو، پنجابی، انگریزی اور جرمن زبانوں کا عالم و عارف، ''جامعہ میونخ'' سے "فارس میں فلسفه مابعد الطبیعات" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا حامل، علوم قدیمہ و جدیدہ، عقلیہ و نقلیہ، فلسفہ و تصوف اور شعر و ادب کے وسیع ذخائر سے فیض یاب و سیراب، منفرد و نادر المثال ہے۔ اقبال کا مقالہ پی ایچ ڈی، انگریزی خطبات بعنوان ''تجدید فکر دینی در اسلام''، ''کتاب الاقتصاد''، ''اِسلام اور احمدیت'' نیز دیگر خطبات و تحریرات اس کے افکار و رجحانات کے مؤثر ترجمان ہیں، مگر اقبال کی بلاد عرب و عجم و شرق و غرب میں لازوال و بے مثال شہرت و مقبولیت اس کے اُردو فارسی کلام منظوم کی مرہون منت ہے جس کے سب علماء و

مفکرین، ادباء ومحققین نیز عامتہ المسلمین پورے عالم عرب واسلام میں معترف و معتقد ہیں۔ نیز برصغیر ومشرق ومغرب کے غیر مسلم اہل فکر ونظر بھی اس سے استفادہ کرنے والے اور اس کے خوشہ چیں ہیں۔

-5 اُردو اور فارسی کلام اقبال (بانگ درا، ضرب کلیم، اسرار خودی، رموز بے خودی، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ وغیرہ) روح قرآن و سنت، شریعت وطریقت اور تاریخ وتصوف اسلام کا ترجمان ہے۔ نیز عطار ورومی و رازی وغزالی، سعدی وہجویری واجمیری وابدالی، مجدد الف ثانی، اورنگ زیب، شاہ ولی اللہ دہلوی، نیز ایوبی وغزنوی، سراج الدولہ وٹیپو سلطان جیسے لاتعداد اکابر اُمتؒ ومجاہدین اسلامؒ کی مختلف النوع روایات فکر وعمل کا تسلسل وتکملہ ہے اور اسلامی معیشت ومعاشرت، سیاست وثقافت نیز دیگر شعبہ حیات میں رجوع الی الاسلام کا پیغام ہے۔

-6 اقبال، مصور پاکستان، مفکر اسلام وعالم اسلام، شاعر مشرق وانسانیت ہے اور فکر وفلسفہ اقبال، فکر وفلسفہ اسلام ہے نیز شعر اقبال، کمال فن ومحاسن ادبیہ کا ترجمان ہے اور اس بناء پر عالم اسلام وانسانیت بالخصوص عرب وعجم میں اقبال کا لاثانی ومنفرد مقام ہے جس کے اعتبار واعتراف اور تجلیل وتعظیم میں اکابر عرب وعجم یک زبان ہیں، مثلاً عباس محمود العقاد، طہٰ حسین، عبدالوہاب عزام، احمد حسن الزیات، محمد حسین ہیکل، مرتضیٰ مطہری، علی خامنہ ای، علی شریعتی، مولانا منہاج الدین، استاد خلیل اللہ خلیلی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر رشید احمد صدیقی، وصدہا دیگر اکابر عرب و عجم۔ ثم تائید وتحسین منجانب صدہا ملایین مسلمانان وغیر مسلمانان۔

و خلاصة الاقوال فيه:

اقبال فیلسوف، سیاستمدار، مجاهد،
محقق، عارف، اسلام شناس، شاعر.
اقبال، مرد دین و دُنیا، ایمان و دانش،
عقل و احساس، فلسفه و ادب، عرفان و
سیاست، خدا و مردم، پرستش و جهاد،
عقیدت و فرهنگ، مرد دیروز و امروز،
پارسای شب و شیر روز بود[27].

❀ ❀ ❀

حواشی

(1) عباس محمود العقاد: فریضة انسانیة، فی الکتاب "اقبال العرب علی دراسات اقبال" (جمع و اختیار و تقدیم: الدکتور ظهور احمد اظہر) المکتبة العلمیة، لاھور، نوفمبر 1977م/ ذو الحجہ 1397ھ، ص 5۔

(2) الدکتور طٰہٰ حسین: اقبال و ابو العلاء المعری، فی الکتاب "اقبال العرب علی دراسات اقبال" للدکتور ظهور احمد اظهر، ص 31۔

(3) نفس المرجع، ص 38-39.

(4) الأستاد احمد حسن الزیات: تحیة لذکری إقبال، فی الکتاب "اقبال العرب علی دراسات اقبال" للدکتور ظهور احمد اظهر، المکتبة العلمیة، لاھور 1977م، ص 27۔

(5) نفس المرجع، ص 28-29.

(6) دکتور محمد حسین هیکل، اقبال شاعر الاسلام فی اقبال العرب علی دراسات اقبال للدکتور ظهور احمد اظهر، المکتبة العلمیة لاھور، 1977م، ص 7-8۔

(7) مذکورہ عرب علماء وفضلاء وشعراء وادباء کے مقالات ومنظومات کے لئے ملاحظہ ہو:

(1) اقبال العرب علی دراسات اقبال، جمع و اختیار و تقدیم، الدکتور ظهور احمد اظہر المکتبۃ العلمیۃ لاہور، نومبر 1977۔

(2) اقبال عرب شعراء کی نظر میں: جمع تحقیق و ترجمہ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، مطبعۃ المکتبۃ العلمیۃ، لاہور، نومبر 1977ء۔

(8) سید مرتضیٰ مطہری، نہضت ہای اسلامی در صد سالہ اخیر، اردو ترجمہ از ڈاکٹر ناصر حسین نقوی بعنوان ''بیسویں صدی کی اسلامی تحریکیں'' مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، راولپنڈی نومبر 1980، ص 37۔

(9) سید علی خامنہ ای ''اقبال ستارہ بلند شرق'' ص 5، اقبال اکادمی، پاکستان، 1994ء۔

(10) دکتر علی شریعتی، ما و اقبال (پیش گفتار) ص 8۔

(11) دکتر علی شریعتی، ما و اقبال، ص 9۔

(12) دکتر علی شریعتی، ما و اقبال، ص 11-12، مقال بعنوان ''اقبال مصلح قرن اخیر'' سخن رانی کنگرہ بزرگداشت اقبال، حسینیہ ارشاد (مجموعہ آثار شمارہ 5) تیر از، انتشارات الہام، دفتر تدوین و انتشار مجموعہ آثار برادر شہید علی شریعتی در اروپا۔

(13) علی شریعتی، ما و اقبال، ص 28۔

(14) علی شریعتی، ما و اقبال، ص 16۔

(15) ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود (حیاتِ اقبال)، ص 1070، مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 2000ء۔

(16) ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام، اقبال اور ملی تشخص، تیرہواں باب (فارسی زبان) ص 326، بزم اقبال، لاہور، بہ اشتراک شعبہ اقبالیات، پنجاب یونیورسٹی، مطبوعات بسلسلہ گولڈن جوبلی، اکتوبر 1998ء۔

(17) دکتر سید محمد اکرم ''اکرام'' اقبال و جہان فارسی، ص 310، مقال ''تاریخ بروایت اشکہا و خونہا (مجموعہ شعر استاد خلیل اللہ خلیلی)، ناشر: شعبہ اقبالیات دانشگاہ پنجاب، لاہور، 1999ء۔

(18) سید ابوالحسن علی ندوی، نقوش اقبال، اُردو ترجمہ ''روائع اقبال'' از شمس تبریز خان (مقالہ بعنوان: میرا تعلق اقبال اور ان کے فن سے) ص 34-36، مطبوعہ مجلس نشریات اسلام، کراچی، برائے سروسز بک کلب، 1988ء۔

(19) ابوالحسن علی ندوی، نقوش اقبال (مقالہ ''شاعر اسلام اقبال۔ حیات وخدمات'' ص 47-48)۔

(20) ابوالحسن علی ندوی، نقوش اقبال، ص 48-49 (مقالہ ''شاعر اسلام، اقبال۔حیات وخدمات'')۔

(21) ابوالحسن علی ندوی، نقوش اقبال، ص 49-50، مقالہ ''شاعر اسلام، اقبال۔حیات وخدمات'' (یہ مقالہ 1951ء میں سعودی ریڈیو سے نشر ہوا تھا)۔

(22) سید ابو الاعلیٰ مودودی، مضمون بعنوان ''بہت کو لوگوں کو معلوم ہے'' مطبوعہ رسالہ ''جوہر'' دہلی، 1938ء، ثم مطبوعہ ہفت روزہ ''آتش فشاں'' لاہور، جلد 7، شمارہ 21، نومبر 1979ء، ص 62۔

(23) ابو الاعلیٰ مودودی ''بہت کم لوگوں کو معلوم ہے'' مضمون، مطبوعہ ('' جوہر'' دہلی 1938ء) ثم دوہفت روزہ '' آتش فشاں'' لاہور، نومبر 1979ء، ص 62۔

(24) ابو الاعلیٰ مودودی ''بہت کم لوگوں کو معلوم ہے'' مضمون، مطبوعہ ''جوہر'' دہلی 1938ء، ثم دوہفت روزہ '' آتش فشاں'' لاہور، نومبر 1979ء، ص 62۔

(25) ابو الاعلیٰ مودودی ''بہت کم لوگوں کو معلوم ہے'' مضمون، مطبوعہ ''جوہر'' دہلی 1938ء، ثم دوہفت روزہ '' آتش فشاں'' لاہور، نومبر 1979ء، ص 62۔

(26) پروفیسر رشید احمد صدیقی، مقدمہ ''نقوش اقبال'' طبع دوم، مجلس نشریات اسلام، کراچی، 1988ء، ص 21-22۔

(27) ڈاکٹر علی شریعتی، ما و اقبال، ص 9۔

✿ ✿ ✿

۴۔ ڈاکٹر علی شریعتی

شخصیت و تصانیف

دکتر علی شریعتی

(شخصیت و تصانیف)

مفکر ایران ڈاکٹر علی شریعتی 1933ء میں مازنان نامی گاؤں میں پیدا ہوئے جو ایران کے مشرقی حصے کے ریگستانی علاقہ (کاویر) میں واقع ہے۔ وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جس نے کئی نسلوں تک مذہبی علوم کی آبیاری کی تھی۔ ان کے والد کا نام محمد تقی شریعتی ہے جن کی شخصیت نے علی پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ علی شریعتی ابتدائی عمر ہی میں اپنا آبائی گاؤں چھوڑ کر مشہد منتقل ہو گئے، جہاں ان کے والد نے مذہبی علوم پڑھانے کی ذمہ داری سنبھالی۔ انہوں نے اپنے والد کی زیرنگرانی وہاں اپنی تعلیم جاری رکھی اور مشہد کے دیگر مذہبی رہنماؤں سے بھی تعلیم حاصل کی۔

علی شریعتی نے بڑے ابتدائی مراحل ہی میں روایتی ماحول سے آگے بڑھنے میں دلچسپی ظاہر کی۔ اپنے والد اور دیگر اساتذہ سے علم وتقویٰ کی جو مضبوط بنیاد انہیں میسر آئی تھی، اسی بنیاد پر انہوں نے نئی جہتوں میں سفر کا آغاز کیا اور اپنے لئے نئی دلچسپیاں مہیا کرتے رہے۔ ان کی ان دلچسپیوں اور مشاغل کا پہلا ثمر عرب مصنف جو وہ السحار کی کتاب ''ابوذر غفاری'' کا عربی سے فارسی میں ترجمہ ہے۔ اس وقت وہ اپنی عمر کے محض دوسرے عشرے میں تھے۔

علی شریعتی نے بعد ازاں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے مشہد کے ''کلیہ تربیت معلمین'' (Teachers' Training College) میں داخلہ لیا۔ یہاں بھی وہ اپنے آپ کو روایتی علوم کے حصول تک محدود نہ رکھ پائے، بلکہ وسیع پیمانے پر مطالعہ نیز فرانسیسی اور دیگر مغربی زبانوں کا علم حاصل کرنا شروع کر دیا اور اپنی کلاس میں سب پر سبقت لیتے ہوئے تعلیم کا اختتام کیا۔ پھر انہیں حکومت کی جانب سے ایک خاص مدت تک تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفہ

پر فرانس بھیج دیا گیا۔ اس دور کو ان کی زندگی کا دور تکوین وتشکیل قرار دیا جاسکتا ہے۔ پیرس میں انہوں نے کل پانچ سال تک قیام کیا۔ اس دوران میں انہوں نے نہ صرف ''علم الاجتماع'' (Sociology) میں اپنی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، بلکہ مختلف النوع نابغہ (Intellectual) اور سیاسی حلقوں کے ایک وسیع دائرہ سے بھی رابطہ استوار کیا۔مثال کے طور پر ان کے الجزائر کے محاذ آزادی کے کئی جلاوطن رہنماؤں کے ساتھ انتہائی قریبی روابط تھے۔ علی شریعتی نے ان کے فرانسیسی زبان میں شائع کئے جانے والے آرگن میں کئی مضامین بھی لکھے۔نیز الجزائری انقلاب کے قائدین سے اپنے روابط ہی کے ضمن میں انہوں نے فرانز فانن (Franz Fanon) کے علمی کاموں سے واقفیت حاصل کی، جو موریطانیہ میں پیدا ہوئے تھے اور انقلاب الجزائر کے حامی نیز اس میں حصہ لینے والوں میں شامل تھے۔ چنانچہ ان سے علی شریعتی نے ''ثقافتی یلغار'' اور ''سامراج کی زیادتیوں کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات'' جیسے افکار اخذ کئے، نیز پہلی مرتبہ فارسی زبان میں ان کی کتب سے کئی اقتباسات ترجمہ کر کے ان کے علمی کارناموں سے ایرانیوں کی دلچسپی کی شمع فروزاں کی جو اب تک ایران میں روشن وتابندہ ہے اور فانن کی زیادہ تر تصانیف کا فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

انقلاب الجزائر کے رہنماؤں سے ان روابط کے علاوہ بھی ڈاکٹر علی شریعتی نے نو آبادیاتی نظام کے خلاف میدان عمل میں جدوجہد کرنے والے فرانس میں موجود اصحاب نیز مختلف مفکرین سے بڑے پیمانے پر روابط استوار کر لئے تھے۔انہوں نے وحدت فکروعمل میں نہ صرف نظری بلکہ عملی دلچسپی بھی ظاہر کی، یعنی ایران اور باقی عالم اسلام کے درمیان وحدت و اتحاد اور اس سے بھی آگے بڑھتے ہوئے عمومی طور پر افریقہ اور تیسری دُنیا کے ساتھ اتحاد و یگانگت۔ جہاں تک ان کے خالص فکری (Intellectual) اور علمی روابط کا تعلق ہے، ان کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ جب وہ فرانس میں تھے تو انہوں نے فرانسیسی مستشرق لوئیس ماسینان (Louis Massignan) کے زیرنگرانی علمی کام کیا اور ان سے ذاتی روابط استوار کئے۔نیز

اس زمانے میں یورپی معاشریات کے تمام بڑے بڑے مفکرین اورنظریاتی رہنماؤں سے ان کا رابطہ قائم رہا۔انہوں نے مارکسزم کا بھی گہرااور منظم مطالعہ کیا۔ یہ مطالعہ دولحاظ سے بڑااہم ہے۔ اولاً اس مطالعہ نے انہیں اس قابل بنایا کہ محض خوف ومفروضات کی بناپرنہیں، بلکہ معلومات کی اساس پر مارکسزم کا تنقیدی جائزہ لیں۔ثانیاً اس کا انداز ایسا ہے جیسا کہ کسی فریق مقابل سے بحث ومباحثہ اورمکالمہ میں ہوتا ہے۔مارکسزم کے ساتھ اس بحث مباحثہ اور مکالمہ نے علی شریعتی کی فکرنیز ان کے علمی کاموں پر ایک خاص نقش ثبت کردیا ہے۔اس لحاظ سے نہیں کہ انہوں نے مارکسزم کے بعض نظریات کو جذب کرلیا ہو، بلکہ اس لحاظ سے کہ انہوں نے مارکسزم کے سامنے کے محاذ کے بعض مسائل سے نبردآزما ہوتے ہوئے وہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے تا کہ انہیں پوری طرح رد کرنے کے قابل ہوسکیں۔

فرانس میں عرب و افریقی رہنماؤں نیز فرانس کی حیات فکری کے قائدین کے ساتھ ان گوناں گوں روابط کے علاوہ علی شریعتی ایران کی جلاوطن سیاست میں بھی بہت زیادہ سرگرم وملوث تھے۔ایران چھوڑنے سے پہلے وہ ''خوف خدا رکھنے والے سوشلسٹ'' (God fearing Socialists) نامی تحریک میں ایک حدتک شریک تھے جو30 اگست 1953ء کی امریکی فوجی بغاوت کے بعد شاہ کے اقتدار کی مخالف تنظیموں میں سے ایک بڑی تنظیم تھی۔تنظیم کے نام میں لفظ''سوشلسٹ'' کی شمولیت کو اس بات کے ثبوت کے طور پر دیکھا جانا چاہئے کہ عرب دُنیا میں اس وقت پائے جانے والے''اسلامی سوشلزم'' کے بعض نظریات ایران کے لئے بھی باعث کشش تھے۔

فرانس میں اپنی تعلیم کے اختتام پرعلی شریعتی ایران لوٹے تو انہیں ترکی سے سرحد عبور کر کے ایران کی سرزمین میں داخل ہوتے ہی فوراً گرفتار کرلیا گیا۔انہیں ان کے اہل خانہ سے جدا کردیا گیا۔حتیٰ کہ انہیں اپنے والد سے ملاقات کا موقع بھی نہ دیا گیا۔ یہ 1964ء کی بات ہے، اس اولین گرفتاری نے یہ واضح طور پر ظاہر کردیا کہ حکومت کی ناراضگی کی وجہ محض ان کی

بیرون ملک سیاسی سرگرمیاں نہ تھیں، جو امریکہ اور یورپ میں مقیم ایرانی طلبہ کے سلسلے میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، بلکہ اس کی وجہ وہ قائدانہ کردار تھا جس کا انہوں نے مظاہرہ کیا تھا۔ نیز جس کا سبب اپنی سوچ اور عمل کو وہ باغیانہ فکری رُخ دینا تھا، جو بیرون ملک ایرانی حزب مخالف میں رائج شدہ معمول کے احتجاج، مظاہروں اور نعرہ بازی سے کہیں ماورا تھا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد علی شریعتی کو اپنی قابلیت اور تعلیمی اہلیت سے مطابقت رکھنے والے کسی تدریسی منصب کے حصول سے روک دیا گیا اور انہیں صرف مختلف ثانوی مدارس میں بحیثیت استاد نیز بعد ازاں "کلیۃ الزراعۃ" (Agricultural College) میں آرٹس کے بعض مضامین پڑھانے کی اجازت دی گئی۔ اس کام میں ایک عرصہ گزارنے کے بعد یا تو کسی انتظامی غلطی کی بناء پر یا کسی اور وجہ سے انہیں "مشہد یونیورسٹی" کے شعبہ علم الاجتماع (Sociology) میں ایک تدریسی آسامی کے حصول کا موقع مل گیا، جہاں انہوں نے خاموشی سے بہت بڑا حلقہ ارادت مندان پیدا کر لیا، یہاں تک کہ ان کی کلاسوں میں صرف ان کے شعبہ کے طلبہ ہی شرکت نہ کرتے تھے، بلکہ جامعہ کے دوسرے شعبوں سے بھی طلبہ شریک ہو جاتے تھے، جس کی وجہ وہ اسلوب اور طریق کار تھا جو انہوں نے اپنی تدریس میں اپنایا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ علی شریعتی پر یونیورسٹی چھوڑ دینے کے لئے دباؤ ڈالا گیا تا کہ ان کے اثرات کی روک تھام کی جا سکے۔ مگر اس کے نتیجہ میں حالات نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا۔ کسی بھی نوعیت کے باقاعدہ تعلیمی تقرر سے محروم کر دیئے جانے کے بعد انہوں نے ملک بھر کے مختلف تعلیمی اداروں میں بڑی تعداد میں لیکچر دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ انہیں ایران بھر کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ کی جانب سے مدعو کئے جانے کا سلسلہ جاری رہا اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز تہران میں "حسینیہ ارشاد" (رہنمائی کرنے والا حسینی مرکز) نامی مذہبی تعلیم کے ادارے کو بنالیا۔ ڈاکٹر علی شریعتی کے اہم لیکچرز زیادہ تر اسی ادارے میں دیئے گئے۔ یہاں بھی لوگوں کی بڑی تعداد ان کے لیکچر سننے کے لئے جمع ہوتی تھی۔ ان لیکچروں میں وہ اپنے خیالات اور

فلسفہ وافکار کو پیش کرتے۔علاوہ ازیں وہ لیکچر دینے کے لئے ملک بھر میں دورے بھی کرتے رہتے تھے۔ ان لیکچروں میں سے بہت سے ریکارڈ کر لئے جاتے اور پھر ٹیپ ریکارڈر سے انہیں صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے کتابی صورت میں چھپا دیا جاتے۔

"حسینیہ ارشاد" کو بالآخر حکومت نے بند کر دیا اور ڈاکٹر علی شریعتی کو گرفتار کر کے اذیت کا نشانہ بنایا۔ جب انہیں رہا کیا گیا تو بین السطور یہ بات تھی کہ وہ ملک چھوڑ جائیں گے۔ ان کی رہائی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ان کے علم میں لائے بغیر تہران کے ایک بڑے روزنامے میں مارکسزم پر ان کے تنقیدی کام کو سلسلہ وار مضامین کی صورت میں شائع کرنے کا آغاز کر دیا گیا، جس کا انگریزی ترجمہ "مارکسزم اور دیگر باطل مغربی افکار" (Marxism and other Western Fallacies) کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اگرچہ ان لیکچروں کا متن تو تقریباً اصل کے مطابق ہی تھا، مگر جن حالات اور جس پس منظر میں انہیں شائع کیا گیا، ان سے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ علی شریعتی نے حکومت سے مصالحت کر لی ہے۔ ڈاکٹر علی شریعتی نے اس پر صدائے احتجاج بلند کی اور قانونی امداد بھی چاہی مگر بے سود۔ پھر انہیں ترک وطن پر مجبور کر دیا گیا۔ انہوں نے اپنے اہل خانہ کو اس امید پر وہیں چھوڑ دیا کہ ان کے چلے جانے کے بعد وہ بھی جلد ہی ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔ علی شریعتی انگلستان آ گئے اور جولائی 1977ء میں پر اسرار حالت میں انتقال کر گئے۔ اس سلسلے میں یقین کی حد تک اس شبہ کا اظہار کیا جاتا ہے کہ انہیں ایران کی سکیورٹی پولیس نے قتل کر دیا۔(1)

ڈاکٹر علی شریعتی جن جدید مسلم مفکرین سے بہت متاثر تھے، ان میں سید جمال الدین افغانی (م 1897ء) شیخ محمد عبدہ (م 1905ء) علامہ محمد اقبال (م 1938ء) اور سید قطب (م 1966ء) سرفہرست ہیں۔ انہیں ان کی زندگی ہی میں "عاشق اقبال" اور "سید قطب ایران" جیسے القاب سے یاد کیا جانے لگا۔ ان کے افکار و خدمات پر تفصیلی کلام کے لئے ایک مستقل بالذات کتاب لکھنے کی فرصت درکار ہے، تاہم اختصار کے ساتھ چند سطروں میں یہ بات

کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والی ایران کی نئی نسل کی غالب اکثریت کو مادی نظریات سے ہٹا کر ایرانی پس منظر میں اسلام کو ان کے قلب و دماغ کا مرکز و محور بنادیا۔ انہوں نے مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بڑی تعداد کو ایرانی انقلاب کا پرجوش کارکن اور علمبردار بنایا، نیز اتحاد اسلامی کے اس سلسلہ کو اپنے مخصوص مذہبی و قومی تناظر میں آگے بڑھایا جس کا پرچم سید جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ اور علامہ محمد اقبال جیسے ابنائے اُمت نے بلند کیا تھا۔ اقبال سے علی کو عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ اس کا اندازہ ان لیکچروں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، جو تہران میں انہوں نے ''حسینیہ ارشاد'' میں دیئے اور جو ''ما و اقبال'' نامی کتاب کی صورت میں چھپ چکے ہیں۔

مفکر ایران ڈاکٹر علی شریعتی علامہ اقبال کے بارے میں "مـــا واقبـــال" میں اپنے مخصوص مذہبی حوالہ سے فرماتے ہیں:

> "ازمیان همه شعرای امروز شیعی، بزرگترین اثر، عالی ترین اثر، هم از لحاظ فکر، هم از لحاظ شدت اخلاص، هم از لحاظ منطق، هم از لحاظ اثر ادبی، دیوان و شعر اقبال است. درباره خانواده پیغمبر اخلاص او را همین بس که در جامعه سنی مذهب است و ستایش گر خاندان پیغمبر در اُردو زبان است و سراینده بهترین مدح ها درباره ائمه شیعه به فارسی". (2)

ترجمہ: دورِ جدید کے تمام شیعہ شعراء کے درمیان فکری لحاظ سے اور شدت اخلاص کے لحاظ سے، نیز منطق و اثر ادبی کے حوالے سے بھی، عظیم ترین و عالی ترین شاہکار دیوان و شعر اقبال ہے۔ خاندان پیغمبرؐ کے بارے میں اقبال کے اخلاص کی یہی دلیل کافی ہے کہ وہ ایک سنی العقیدہ معاشرہ کا فرد ہے اور اُردو زبان میں مدح خوان خاندان پیغمبرؐ ہے، نیز فارسی میں ائمہ شیعہ کی تعریف میں بہترین نظمیں کہنے والا ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی بنیادی طور پر ایک مذہبی مفکر ہیں۔ مشرق و مغرب میں مذہبی ولادینی اداروں میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی وجہ سے ان کی ذات میں قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کا امتزاج ظاہر ہوا۔ وہ ایک ایسی شخصیت ہیں جو مذہبی حمیت و علوم اور فکر و عمل کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ جدید طرز تحقیق و تنقید اور غیر جذباتی غور و فکر کی بھی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے ''سنی۔ اثناعشری'' اور ''شیعہ۔ سنی'' تاریخی و اعتقادی مسائل میں بھی حتی الامکان حقیقت پسندانہ روش اختیار کرنے کی کوشش کی جو انتہا پسندانہ صفوی روایات پر مبنی تشیع کے مقابلے میں افہام و تفہیم اور اختلافات کا دائرہ محدود تر کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔ علی شریعتی نے صفوی دور (1502-1736ء) کو دور ملوکیت قرار دیتے ہوئے ''صفوی تشیع'' کے مقابلے میں ''علوی تشیع'' کی اصطلاح رائج کی اور عصر جدید میں تشیع کی بعض ظاہری رسومات کو ان کی موجودہ صورت میں بے روح اور غیر مؤثر قرار دیتے ہوئے اس فکر و فلسفہ کے احیاء کی تلقین کی ہے جو ان کی رائے میں ''حسینیت'' کی اصل روح و فلسفہ ہے، یعنی طاغوت کے خلاف احتجاج مسلسل اور ظلم و ناانصافی کے خلاف جہاد مظلومان، تا کہ عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ انہوں نے صفویوں کے دور میں جبر و تشدد کے ذریعے لوگوں کو ایک مخصوص مسلک اختیار کرنے پر مجبور کرنے کی صفوی روایت کی مذمت کرتے ہوئے اسے شیعہ روایت سے انحراف قرار دیا۔ چنانچہ شریعتی نے حقیقی شیعی فکر کی تجدید کی بڑی حد تک کامیاب کوشش کی۔ ''سنی۔ اثناعشری'' اختلافات کو کم کرنے کے سلسلے میں علی شریعتی کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر حامد الگر (الجار) فرماتے ہیں۔

> "Also important in Dr. Shariati's view of Shia school was his attempt to interpret it in such a way as not to exaggerate and enlarge the inevitable differences between Shiah and Sunni Muslims.(3)

ترجمہ: ڈاکٹر شریعتی کے شیعی مکتب فکر کے بارے میں نقطہ نظر کے

حوالے سے یہ بات بھی اہم ہے کہ انہوں نے شیعہ مذہب کی ایسی تشریحات کرنے کی کوشش کی جو شیعہ اور سنی مسلمانوں کے درمیان موجود حقیقی اختلافات عقائد کو بڑھا چڑھا کر پیش نہ کریں۔

چنانچہ علی شریعتی نے اپنی معروف تصنیف ''فاطمہ فاطمہ است'' میں سیدہ فاطمہؓ سے پہلے اولادِ رسولؐ میں سے سیدہ زینبؓ و رقیہؓ و ام کلثومؓ و قاسمؓ و عبداللہؓ کی ولادت کا ذکر بھی بڑے مؤثر انداز میں فرمایا ہے:

''همه در انتظار اند تا ازیں خانه پسرانی برومند بیرون آیند و به خاندان عبدالمطلب و خانواده محمد قدرت و اعتبار و استحکام بخشند.

فرزند نخستین دختر بود: زینب.

اماخانواده در انتظار پسر است.

دومی دختر بود: رقیه.

انتظار شدت یافت و نیاز شدیدتر.

سومی: ام کلثوم.

دو پسر قاسم و عبدالله آمدند– مژده بزرگی بود– امانه درخشیده افول کردند– واکنون دریں خانه سه فرزند است و هرسه دختر–

مادر پیر شده است و سنش از شصت میگزرد– وپدر گرچه دخترانش را عزیز می دارد، اما با احساسات قومش و نیاز و انتظار خویشانش شریک است–

آیا خدیجه که باپایان عمر نزدیک شده است فرزندی

خواهد آورد؟ امید سخت ضعیف شده است–
آری– شور و اُمید دریں خانہ جان گرفت و التهاب به آخرین نقطه اوج رسید– ایں آخریں شانس خانواده عبدالمطلب است و آخرین اُمید–
امام...... باز هم دختر–
نامش را فاطمه گزاشتند"[4]

ترجمہ: سب لوگ انتظار میں ہیں کہ اس گھرانے سے آبرومند فرزند نمودار ہوں اور خاندان عبدالمطلب وخانوادہ محمدؐ کو قوت واستحکام ومعتبر مقام عطا کریں۔
پہلا بچہ پیدا ہوا تو وہ لڑکی تھی......زینبؓ۔
مگر خاندان کو تو بیٹے کا انتظار ہے۔
دوسری مرتبہ بھی بیٹی پیدا ہوئی......رقیہؓ۔
تیسری مرتبہ..........اُم کلثومؓ۔
دو بیٹے قاسمؓ وعبداللہؓ پیدا ہوئے۔ یہ بہت بڑی خوشخبری تھی، مگر پروان چڑھے بغیر ہی وفات پا گئے۔ اب اس گھرانے میں تین بچے ہیں اور تینوں ہی بیٹیاں۔
ماں بوڑھی ہو چکی ہے۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے آگے بڑھ رہی ہے اور باپ اگر چہ اپنی بیٹیوں کو عزیز رکھتا ہے، مگر اپنے قبیلے کے احساسات، انتظار اور توجہ میں ان کے ہمراہ شریک ہے۔
آیا خدیجہؓ جو کہ اپنی آخری عمر کے قریب پہنچ چکی ہیں، بیٹے کو جنم دے پائیں گی؟
اُمید بہت کم رہ گئی ہے۔

مگر ہاں ۔ اس گھرانے میں پھر ہلچل اور اُمید کی کرن دکھائی دے رہی ہے
اور جوش و خروش اپنے آخری نقطہ عروج تک جا پہنچا ہے ۔
یہ خانوادہ عبدالمطلب کے لئے آخری چانس اور آخری اُمید ہے ۔
مگر......ایک بار پھر لڑکی پیدا ہوئی ۔
انہوں نے اس کا نام فاطمہؓ رکھا۔

اگر چہ اہل تسنن کے نزدیک ''اجماع اُمت'' کی رُو سے سیدنا ابوبکرؓ ازروئے نص قرآنی ''ثانی اثنین'' صاحب رسولؐ اور ''نبیؐ کے ہمراہ معیت الٰہی کے حامل ہیں'' (**ثانی اثنین إذهما في الغار إذ يقول لصاحبه لا تحزن إن الله معنا... التوبة: 40**) نیز فتح مکہ و غلبہ اسلام کے بعد بحکم نبوی اولین امیر الحج (9 ھ) اور پھر وفات رسولؐ سے پہلے امام نماز مقرر فرمائے گئے (ثانی اسلام و غار و بدر و قبر ۔ اقبال) مگر شورائی امامت و خلافت ابوبکرؓ (عمر بوقت خلافت:60 سال) کے حق میں سنی اکثریت کے تمام تر دلائل و براہین شرعیہ کے باوجود شیعی دلائل بحق عقیدہ امامت و خلافت منصوصہ و معصومہ کی رو سے سیدنا علیؓ (عمر بوقت وفات رسولؐ: تقریباً 33 برس) ہی اول امام منصوص و معصوم اور حقدار خلافت بلافصل تھے اور یہی شیعی عقیدہ دکتر علی شریعتی کا بھی ہے، مگر اس حوالہ سے (بقول شریعتی) حامیان خلافت علیؓ کی مختصر جماعت کے مقابلے میں اکثر و بیشتر صحابہ کرامؓ کی جانب سے شورائی امامت و خلافت ابوبکر صدیقؓ کی تائید و حمایت کا تذکرہ کرتے ہوئے شریعتی ان صحابہ کبارؓ کے محاسن و مناقب کا بھی بڑے شاندار الفاظ میں اعلان و اعتراف فرماتے ہیں:

''ابوبکر است نخستین کسیکه بیرون از خانواده پیغمبر به او گروید– یار غار او، همگام هجرت او، پدر همسر او ام المومنین– کسیکه در بیکسی و غربت پیغمبر به او دست یاری داد و همه ثروت خویش رادر راه ایمان به او نابود

کرد– ودر مدینه چنان تهیدست شد که پیش یهودیان پست و مردم بیگانه و حقیر مدینه کاری کرد– وکسیکه همه مردم بیست وسه سال تمام از نخستین سال بعثت تامرگ پیغمبر او راهمه جا در کنار او دیده اند–

وعمر چهلمین کسیکه درمخفی گاه پیغمبر خانه ارقم بن ابی ارقم به او گروید، وباپیوستن او و حمزه به جمع اندک و ضعیف یاران نخستین پیغمبر مسلمانان نیرو گرفتند و آشکار شدند– واز آن هنگام همه نیروئی خویش وقف پیشرفت این نهضت کرد، واز نزدیکترین یاران پیامبر و برجسته ترین مهاجران بود– و مردم او راکه پدر حفصه ام المومنین نیز بود از رهبران بزرگ و اصحاب کبار رسول خدامی دانستند–

وعثمان مهاجر ذو هجرتین اسلام است و داماد ذوالنورین پیغمبر– مرد باحشمت و تقدس مآب به دو خانواده قریش– وکسیکه باثروت بسیارش درجمع یاران فقیر پیغمبر در امور خیر کمکهای مؤثر کرده است درمیان توده مردم به عنوان یکی از اصحاب قدیم و مهاجران بزرگ و دوستان وخویشان نزدیک پیغمبر در او مینگرند–

وخالد بن ولید که در جهاد بادشمنان اسلام قهرمانیها کرد و در موته که سربازی ساده بود، نه شمشیر برسر رومیان

شکست و ''سیف اللّٰه'' لقب داشت-

وعمرو عاص یکی از چهار نابغه معروف عرب که سالها سال به مسلمین پیوسته و در مرزهای شمال به قدرت امبراطور روم ضرب شست اسلام نشان داده است-

وسعد بن أبی وقاص نخستین کسی که در اسلام تیری به روی دشمن رها کرده و مسلمانان را از مرحله دفاعی بدر آورده و حالت حمله رابه دشمن اعلام کرده است- و در احد با تیر باران دقیق و زبردستانه اش ازجان پیغمبر که سخت به خطر افتاده بود و تنها مانده بود دفاعی کرده بود که پیغمبر با تعمیر ویژه اور راستائش کرد-

ودیگران و دیگران وسپس تائید مهاجران بزرگ و انصار بزرگ وهمه سران و سرداران و پیشگامان اسلام و نزدیکترین یاران و همگامان پیغمبر-[5]

ترجمہ: ''ابوبکرؓ، خاندان پیغمبرؐ سے باہر کی پہلی شخصیت ہیں جو آپ پر ایمان لائی۔ آپ کے یار غار، رفیق ہجرت، آپ کی شریک حیات ام المومنین (عائشہؓ) کے والد- وہ ہستی جس نے پیغمبر کی بے کسی وغریب الوطنی کے زمانہ میں انہیں دوستی کا ہاتھ دیا اور اپنی تمام دولت وثروت کو آپ پر ایمان لانے کی راہ میں خرچ کردیا۔اور مدینہ میں اتنے تہی دست ہو گئے کہ مدینہ کے یہودیان پست اور مردم بیگانہ وحقیر کے ہاں اجرت پر کام کرتے رہے۔ وہ شخصیت جسے لوگوں نے بعثت کے اولین سال سے وفات پیغمبرؐ تک تئیس برس ہر مقام پر پیغمبرؐ کے شانہ بشانہ پایا ہے''۔

اورعمرؓ، چالیسویں فرد ہیں، جو مخفی گاہ پیغمبرؐ دار ارقم بن ابی ارقم میں اسلام سے وابستہ ہوئے۔ ان کے اور حمزہ کے، اصحاب پیغمبرؐ کی ابتدائی مٹھی بھر کمزور جماعت میں شامل ہونے سے مسلمانوں کو تقویت ملی اور وہ کھلم کھلا سامنے آ گئے۔ اس وقت سے عمر نے اپنی تمام تر قوت اس تحریک کی ترقی کے لئے وقف کر دی۔ آپ پیغمبرؐ کے قریب ترین دوستوں اور برجستہ ترین مہاجرین میں سے تھے۔ نیز ام المومنین حفصہ کے والد بھی تھے، چنانچہ لوگ آپ کو رسول خدا کے اصحاب کبار اور عظیم قائدین میں شمار کرتے تھے۔

اور عثمانؓ، جنہوں نے اسلام میں دو ہجرتیں فرمائیں، نیز پیغمبرؐ کے داماد ذوالنورین تھے۔ قریش کے دو خاندانوں سے تعلق رکھنے والے تقدس مآب و با حشمت - وہ شخصیت جنہوں نے پیغمبرؐ کے غریب صحابہ کی جماعت میں اپنی کثیر دولت کے ذریعے امور خیر میں مؤثر امداد فرمائی، جو لوگوں کی نظر میں پیغمبرؐ کے قدیم صحابہ، عظیم المرتبت مہاجرین و رفقاء اور قریبی رشتہ داروں میں سے ایک تھے۔

اور خالدؓ بن ولید جنہوں نے دشمنان اسلام سے جہاد میں بارہا ایک ہیرو کی طرح داد شجاعت دی تھی۔ جنگ موتہ میں جبکہ وہ محض ایک عام سپاہی کی حیثیت سے شریک تھے، لڑتے لڑتے رومیوں کے سروں پر نو تلواریں توڑیں اور ''سیف اللہ'' کا لقب پایا۔

اور عمروؓ بن عاص جو عرب کے چار مشہور نابغوں میں سے ایک تھے، جنہوں نے سالہا سال اہل اسلام سے وابستہ رہتے ہوئے شمالی سرحدوں کی جانب رومی شہنشاہیت پر اسلام کی ضرب کاری لگائی تھی۔

اور سعد بن ابی وقاص، اسلام کی وہ پہلی شخصیت جس نے دشمن کے روبرو

تیر اندازی کرتے ہوئے مسلمانوں کو دفاعی مرحلہ سے باہر نکالا اور دشمن پر جارحانہ حملہ کا اعلان کیا۔ جنہوں نے غزوۂ اُحد میں تیروں کی تیز اور زبردست بوچھاڑ کے ذریعے پیغمبرؐ کی جان کا اس وقت دفاع کیا، جبکہ وہ سخت خطرہ میں تھی اور آپ یک و تنہا رہ گئے تھے۔ جس پر پیغمبرؐ نے ان کی جانثاری کی تعریف فرمائی۔

نیز دیگر بے شمار اصحاب جن کو مزید عظیم المرتبت انصار و مہاجرین، قائدین و سرداران اسلام و نزدیک ترین یاران وھمگامان پیغمبر کی تائید و حمایت حاصل تھی۔

سیدنا عثمانؓ کے ذوالھجرتین (دوہجرتوں والا) ہونے کی تشریح کرتے ہوئے شریعتی لکھتے ہیں:

''هجرت به حبشه و سپس هجرت به مدينه''۔(6)

ترجمہ: حبشہ کو ہجرت اور اس کے بعد مدینہ کو ہجرت۔

سیدنا عثمانؓ کے ذوالنورین (دونوروں والا) ہونے کی تشریح کرتے ہوئے علی شریعتی لکھتے ہیں:

''شوهر رقيه و سپس شوهر ام كلثوم دختران پيغمبر كه در آغاز عروس ابولهب بودند- و پس از بعثت بدستور وى پسرانش آنها را طلاق گفتند، تاهم به پيغمبر اهانت كرده باشند، وهم او را درفشار روحى و مالى قرار داده باشند- وعثمان كه جوانى ثروتمند بود، و از دو خانواده اشرافى (از پدر به بنى اميه و از مادر به بنى هاشم) رقيه را گرفت و با او حبشه هجرت كرد- در مدينه رقيه مرد، و سپس

ام کلثوم را گرفت- لقب "ذوالنورین" از اینجا است-(7)

ترجمہ: پیغمبرؐ کی بیٹیوں، رقیہؓ اور بعد از اں ام کلثومؓ کے شوہر- جو پہلے ابولہب کے بیٹوں کی منکوحہ تھیں اور بعثت کے بعد اس کے حکم پر اس کے بیٹوں نے انہیں (بلا رخصتی) طلاق دے دی تھی۔ تا کہ پیغمبرؐ کی توہین کر سکیں اور انہیں ذہنی و مالی دباؤ میں بھی مبتلا کر دیں۔

عثمانؓ نے جو کہ دولت مند جوان تھے، نیز دو معزز خاندانوں (باپ کی طرف سے بنو امیہ اور ماں کی طرف سے بنو ہاشم) سے تعلق رکھتے تھے، رقیہ سے شادی کر لی اور ان کے ہمراہ حبشہ کو ہجرت کر گئے۔ مدینہ جا کر رقیہؓ فوت ہو گئیں تو ان کے بعد ام کلثومؓ سے شادی کر لی۔ ''ذوالنورین'' کا لقب اس وجہ سے ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی نے شیعی عقیدہ کے مطابق سیدنا علیؓ کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ:

''از اصل احقیت خویش در امر خلافت و غصب حق خویش چشم نپوشید''-(8)

ترجمہ: ''علیؓ نے کبھی اس اصولی بات سے چشم پوشی نہیں کی تھی کہ خلافت کے معاملہ میں ان کا حق زیادہ تھا، مگر انہیں ان کا حق پہلے نہیں دیا گیا''۔

مگر اس کے باوجود ان کی مد مقابل شخصیات کے فضائل کا بھی اعتراف فرمایا ہے۔ چنانچہ علی شریعتی شہادت عمرؓ (یکم محرم 24ھ) کے حوالہ سے رقمطراز ہیں:

''در نهج البلاغه که سید رضی شیعی، جمع کرده و محمد عبده سنی تصحیح نموده، از عمر این چنین یاد می کند:
للّٰه بلاد فلان فقد قوّم الأود، وداوی العمد، و أقام السنة،

وخلف الفتنة، ذهب نقيّ الثوب، قليل العيب، أصاب خيرها، وسبق شرها، أدى الى اللّٰه طاعته، واتقاه بحقه، رحل وتركهم في طرق متشعبة، لايهتدى فيها الضال، ولا يستيقن المهتدى–

بزرگواری، ادب انسانی، انصاف، اعتراف از ارزش های رقیب، ستائش از فضیلت های کسی که نقیصت های نیزدارد، عیب و هنر دیگری راگفتن، در آغاز خدمات و صفات مثبت کسی راگفتن و در پایان از او باتعبیری عمیق، و در عین حال مؤدبانه انتقاد کردن، درسی است که علی به انسانیت می آموزد، وبویژه به ناقدان و قضاوت کنندگان درباره شخصیت ها وحتی درباره مخالف–

آفرین بر (عمر) کجی را راست کرد، ودرد را درمان نمود، وسنت رسول را برپا داشت، و فتنه را پشت سرگزاشت، پاکدامن رفت،اندک عیب، خیر خلافت رابه چنگ آورد ، از شرش پیشی جست، طاعت خداوند راادا کرد، وبرحقش تقوی ورزید، رحلت کرد وخلق را درراه های شعبه رها کرد آنچنانکه گمراه در آن راه نمی یابدو انسان در راه استوار نمی ماند–

(نهج البلاغه: ترجمه آقای فیض الاسلام، ص 712، سخن 219)". [9]

ترجمہ: "نہج البلاغۃ" میں جسے شیعہ سید رضی نے جمع فرمایا اور سنی محمد عبدہ نے تصحیح فرمائی علیؓ نے عمرؓ کی وفات پر ان کا یوں تذکرہ فرمایا ہے:

آپ (عمرؓ) پر آفرین ہو- آپ نے ٹیڑھے پن کو درست کیا، درد کا درماں کیا، سنت رسولؐ کو قائم کیا، فتنہ کو پس پشت ڈال دیا۔ یوں رخصت ہوئے کہ دامن پاک تھا اور کمی تھوڑی۔ آپ نے خیر خلافت کو حاصل کرلیا اور اس کے شر سے بالاتر رہے۔ اللہ کی اطاعت کی اور اس کا کماحقہ تقویٰ اختیار کیا۔ اب رحلت فرما گئے ہیں تو لوگوں کو متفرق راستوں پر چھوڑ گئے ہیں، جہاں راستہ گم کرنے والے کو راہ سجھائی نہیں دے رہی اور واقف راہ کو یقین کامل حاصل نہیں۔

یہ ہے بزرگواری، ادب انسانی، انصاف، مدمقابل کی خوبیوں کا اعتراف، ایسی شخصیت کے فضائل کی مدح سرائی جس میں بعض کمیاں بھی (ہوسکتی) ہیں، کسی کے عیب وہنر پر گفتگو کرتے ہوئے ابتداء میں اس کی مثبت خدمات وصفات کا ذکر کرنا اور بعد میں باتعبیری عمیق اور مؤدبانہ انداز میں انتقاد کرنا، یہ وہ درس وسبق ہے جو علیؓ انسانیت کو اور بالخصوص ناقدین وانصاف کنندگان کو مختلف شخصیات حتیٰ کہ مخالفین کے معاملہ میں بھی سکھلا رہے ہیں۔

ڈاکٹر علی شریعتی بحیثیت شیعہ، حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ کے مقابلے میں جناب علیؓ کو منصب امامت وخلافت کا اولیں منصوص ومعصوم حق دار قرار دیتے ہیں، مگر اس کے باوجود ایران کو سولہویں صدی کے آغاز میں پہلی بار شیعہ ریاست قرار دے کر صدیوں تک حکمران رہنے والے صفوی بادشاہوں (1502-1736ء) کی شیعہ حکومتوں کے مقابلے میں سیدنا ابوبکرؓ وعمرؓ حتیٰ کہ سیدنا عثمانؓ ومعاویہؓ کے طرز حکومت کو بھی بہتر وبرتر قرار دیتے ہیں:

"سلاطین صفوی و رژیم صفویہ کہ حق ندارد از رژیم حکومت ابوبکرؓ و عمر حتی عثمان و معاویہ انتقاد کند"۔[10]

ترجمہ: ''صفوی بادشاہوں اور حکومتوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ابوبکر وعمر حتیٰ کہ عثمان

ومعاویہ کے نظام حکومت پر بھی کوئی تنقید کریں''۔

ڈکٹر علی شریعتی سب وشتم کی مذمت میں قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے سیدنا علیؑ کے قول کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ انہوں نے بنوامیہ کو بھی سب وشتم کرنے سے منع فرمایا تھا:

"قرآن صریحاً به شخص پیغمبر دستور می دهدکه حتی مشرکان رادشنام مده: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدعُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ (108/6)سوره انعام:108

وقرآن ناطق نیز نفرت خود را از بدزبانی و فحاشی که نماینده روح زشت و پست دشنام دهنده است، نه دشنام گیرنده، رسماً بیان می کند– واز اینکه پیروان او فحاش باشند بیزار است: إنی أکره أن تکونوا سبّابین (من از اینکه شما فحاش باشید نفرت دارم) درجنگ بابنی امیه و درباره آنهامی گوید''.(11)

ترجمہ: قرآن نے ذات پیغمبرؐ کو صراحت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ مشرکوں کو بھی گالی مت دو: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدعُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ (108/6) سوره انعام 108
اور جولوگ اللہ کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں ان کو بھی سب وشتم مت کرو۔
اورقرآن ناطق (علیؑ) نے بذاتِ خود بھی بدزبانی وفحش گوئی سے جو کہ گالی کھانے والے کے بجائے گالی دینے والے کی بری اور پست ذہنیت کی ترجمان ہے، باقاعدہ اپنی نفرت ظاہر فرمائی ہے اور یہ بھی کہ وہ اس بات سے بیزار ہیں کہ ان کے پیروکار فحش گو بنیں: إنّی أکره أن تکونوا سبّابین (میں اس بات سے کہ تم فحش گو بنو نفرت کرتا ہوں)
وہ (علیؑ) یہ بات بنی اُمیہ سے جنگ کے حوالہ سے اور انہی (بنی اُمیہ) کے

بارے میں فرمارہے ہیں۔

ڈکترعلی شریعتی نے اپنی مختلف تصانیف وتقاریر میں صحابہ کرامؓ کے مناقب ومحاسن کے اعتراف کے باوجود مختلف مقامات پر سیدنا علیؓ کی امامت وخلافت منصوصہ ومعصومہ نیز دیگر شیعی اثنا عشری افکار ومعتقدات کی تائید واثبات کرتے ہوئے وفات نبوی کے بعد صحابہ کرامؓ کے مختلف مواقف پر ایسی آراء بھی دی ہیں، جو جمہور علماء ومحققین کے نقطۂ نظر سے قابل نقد ورد دید ہیں۔(12)

مگر اس سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ کسی غیر سنی مسلم فرقہ سے تعلق رکھنے والے مفکر ومحقق کی جانب سے اُمت مسلمہ کی غالب سنی اکثریت کی کتب حدیث وفقہ وتفسیر نیز علم کلام وتاریخ وتصوف سے اقتباس واستفادہ اور مدح وستائش صحابہؓ کا یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ وہ اجماع اُمت اور علوم وعقائد اہل سنت سے صدفی صد متفق ہوچکا ہے اور اب وہ قرآن وسنت، مذاہب اربعہ، امامت وخلافت ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ، مقام صحابہ کرامؓ نیز قبول روایات حدیث و تفسیر وودیگر علوم دین از جملہ صحابہ کرامؓ واہل بیت عظامؓ کے سلسلہ میں کاملاً سنی عقیدہ اور طرز فکر و عمل اختیار کرے گا، لہٰذا مختلف الفکر افراد و آراء کے حوالہ سے مثبت اقوال وافکار کی تعریف و توصیف اور قابل نقد واحتساب اقوال وافکار کی مدلل تردید ہی مناسب علمی ودینی طرز عمل قرار پاتا ہے۔

چنانچہ اختلاف عقائد کے باوجود حتی الامکان افہام وتفہیم نیز پرامن بقائے باہم اور دشمنان ملک وملت کے مقابلے میں مکمل اتحاد کے اسی نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے ڈکترعلی شریعتی کا درج ذیل بیان ملاحظہ ہو:

''مقصودم از "وحدت'' همان طوریکه بارها گفته ام،
وحدت صف مسلمانان شیعی و غیر شیعی در برابر
امپریالزم و صهیونیسم است، نه که وحدت مذهب شیعه و

مذهب سنت است، نه اینکه تشیع و تسنن باهم یکی شوند.
اساساً آدمی که این حرف "وحدت تشیع و سنن" رامی زند، معلوم می شود که اصلاً هیچ چیز رانمی داند، نه از تشیع و تسنن خبردارد، نه از تاریخ، و نه از مذهب، و نه هم از مسائل علمی و عقلی".
هرگز هرگز نباید شیعه از مبانی اعتقادی خود صرف نظر کند".(13)

ترجمہ: ''وحدت'' سے میری مراد، جیسا کہ میں نے کئی مرتبہ بیان کیا ہے، سامراجیت اور صیہونیت کے مقابلہ میں شیعہ وغیر شیعہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد ہے، نہ کہ وحدت مسلک شیعہ و مسلک سنی، نہ ہی یہ مقصد ہے کہ ''تشیع'' اور ''تسنن'' باہم ایک عقیدہ بن جائیں۔ بنیادی طور پر ہر وہ شخص جو کہ اعتقادی ''وحدت تشیع و تسنن'' کا نعرہ لگاتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت وہ کسی بات کا علم نہیں رکھتا، نہ تو وہ ''تشیع و تسنن'' سے واقف ہے اور نہ ہی وہ تاریخ و مذہب نیز علمی و عقلی مسائل کی خبر رکھتا ہے۔
شیعوں کو ہرگز ہرگز اپنی اعتقادی بنیادوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر علی شریعتی کے حوالہ سے یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ انقلاب ایران (1979ء) سے پہلے ایرانی شاہنشاہیت اور ''صفوی تشیع'' کے سیاسی و مذہبی پس منظر میں علی شریعتی (1933ء۔1977ء) ایک ایسے مؤثر اور نمایاں تر ایرانی مفکر ہیں، جنہوں نے تجدید فکر شیعی کے حوالہ سے لاکھوں جدید تعلیم یافتہ شیعان ایران کو اپنا حامی وہمنوا بنانے میں عظیم الشان

کامیابی حاصل فرمائی، حتیٰ کہ ان کے ''حسینیہ ارشاد'' میں سید مرتضیٰ مطہری (1919-1979ء) جیسے جلیل القدر شیعہ علماء بھی خطاب فرماتے رہے ہیں، تاہم ڈاکٹر علی شریعتی نے نقد رسومات نیز مختلف اثنا عشری معتقدات و اصطلاحات کی تاویل وتشریح میں ایسا منفرد اور جدید انداز اختیار کیا ہے جو روایتی طبقہ علماء کی کثیر تعداد کے نزدیک بعض حوالوں سے قابل نقد وبحث ہے۔

علی شریعتی نے ''تشیع علوی وتشیع صفوی'' کے زیر عنوان ''علوی تشیع'' کے حوالہ سے جو تعریفات وتشریحات پیش کی ہیں، ان میں سے چند ایک بطور مثال درج کی جارہی ہیں، جبکہ کامل تحقیق وتجزیہ کے لئے ان کی مختلف تصانیف بالخصوص ''تشیع علوی وتشیع صفوی'' کا تفصیلی مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس کے ساتھ ہی علی شریعتی یہ وضاحت بھی فرماتے ہیں کہ ہر دو تشیع (علوی وصفوی) اصول وفروع کے لحاظ سے ایک ہی ہیں، مگر تشیع صفوی نے تشیع علوی کے فکری وذہنی قالب اپنا کر اُس کی رُوح کو ختم کر دیا تھا:

در هر دو تشیع اصول و فروع یکی است، باهم هیچ اختلاف ندارند و مشکل بودن تشخیص هم از همین جا است که تشیع صفوی آمد و پایه های خود بر روی تشیع علوی بناء کرد، قالب های فکری و ذهنی تشیع علوی را گرفت، محتوایش را خالی کرد''۔(14)

در تشیع علوی

وصایت

یعنی توصیهٔ پیغمبر، به فرمان خدا برای نشان دادن لایق ترین، ذیحق ترین، بر مبنای علم و تقوی که در خاندان اویند۔

ترجمہ: یعنی حکم خدا کے مطابق پیغمبرؐ کی وصیت، اس ہستی کی نشاندہی کے لئے جو علم وتقویٰ کی بنیاد پر ان کے خاندان میں لائق ترین اور سب سے زیادہ حق دار ہے۔

امامت

یعنی رهبری پاک انقلابی برای هدایت مردم و بنای درست جامعه و بردن اجتماع بسوی آگاهی و رشد و استقلال رای و شخصیتهایی که "انسان مافوق" اند، و تجسم عینی مذهب اند برای شناختن و پیروی کردن، و از آنها آگاهی و تربیت یافتن.

ترجمہ: یعنی پاکیزہ انقلابی رہنمائی، انسانوں کی ہدایت، معاشرہ کی صحیح تعمیر اور اسے آگاہی وہدایت وآزادی کی جانب لے جانا۔ وہ ایسی شخصیات ہیں جو "اعلیٰ وبرتر انسان" ہیں اور سراپا مذہب کی ایسی مجسم تصویر ہیں جن کی شناخت اور پیروی کی جا سکے اور جن سے آگاہی وتربیت حاصل کی جا سکے۔

عصمت

یعنی اعتقاد به پاکی و تقوای رهبران فکری و اجتماعی، پیشوایان مسئول ایمان، علم و حکمت مردم، یعنی نفی حکومت خائن، نفی پیروی از عالم ناپاک، روحانی نادرست و وابسته به دستگاههای خلافت.

ترجمہ: یعنی ان فکری و اجتماعی رہبروں کی پاکیزگی اور تقویٰ پر اعتقاد رکھنا جو انسانوں کے ایمان اور علم وحکمت کے ذمہ دار امام اور پیشوا ہیں۔ یعنی خیانت کار کے اقتدار کی نفی، غیر پاکیزہ عالم، غیر صحیح روحانی اور وابستۂ بارگاہِ حکومت کی نفی۔

ولایت

یعنی تنها دوستی و رهبری و حکومت علی و علی وار را پذیرفتن و لا غیر، دوستی علی زیرا او نمونۂ عالی بندگی خدا است، رهبری اش چون چراغ روشن هدایت است ورائد راستین قبیلۂ بشریت، وحکومتش چون تاریخ انسان آرزوی عدل و آزادی و برابری او را درپنج سال حکومتش دارد و ملت هاهمه به آن نیاز مندند.

ترجمہ: یعنی صرف علیؑ اور علیؑ سے مشابہت رکھنے والوں کی دوستی ورہبری وحکومت کی پذیرائی کرنا، کسی اور کی نہیں، علیؑ کی دوستی کیونکہ وہ بندگیٔ خدا کا اعلیٰ نمونہ ہیں، اُنہی کی رہبری کیونکہ وہ ہدایت کا روشن چراغ اور قبیلۂ بشریت کے برحق قائد ہیں اور انہی کی حکومت کیونکہ انسانی تاریخ، عدل و آزادی و مساوات کا نظارہ ان کی پانچ سالہ حکومت میں دیکھ چکی ہے اور تمام قومیں اس کی حاجت مند ہیں۔

عدل

عقیده ایست دربارۂ صفت خدا که عادل است و جهان برعدل است و نظام اجتماع و زندگی نیز باید بر عدل باشد، و ظلم و نا برابری نظامی غیر طبیعی و ضد الهی است، و عدل یکی از دو پایۂ اساسی مذهب است، که عدل هدف رسالت أست، شعار بزرگ اِسلام است.

ترجمہ: خدا کی اس صفت کے بارے میں عقیدہ کہ خدا عادل ہے اور معاشرہ وزندگی

کا نظام بھی عدل وانصاف پر مبنی ہونا چاہئے نیز یہ کہ ظلم وعدم مساوات کا نظام غیر فطری وخلافِ منشائے الٰہی ہے۔عدل مذہب کے دو بنیادی ستونوں میں سے ایک ہے۔عدل مقصودِ رسالت اور عظیم شعارِ اسلام ہے۔

اجتهاد

عامل حرکت مذهب در زمان و پا بپای تاریخ و انقلاب دائمی و تکاملی در بینش مذهبی و تکامل و تناسب حقوقی در تغییر و تحول نظام.

ترجمہ: تاریخ کے دوش بدوش ہر زمانے میں مذہب کی حرکت کا محرک نیز مذہبی بصیرت میں دائمی وکامل انقلاب اور تبدیلی وتحول نظام میں حقوق وقوانین کے لحاظ سے تکامل وتناسب کا ذریعہ۔

تقلید

رابطۀ منطقی و علمی و طبیعی و لازم میان عامی یا غیر متخصص با عالم متخصص علوم مذهبی، در مسائل عملی و حقوقی که جنبۀ فنی و تخصصی دارد. (15)

ترجمہ: مذہبی علوم میں مہارت وتخصص رکھنے والے عالم اور غیر متخصص عام فرد کے مابین ان عملی وقانونی فقہی مسائل میں فطری لحاظ سے لازم وناگزیر علمی ومنطقی رابطہ جو فنی واختصاصی نوعیت کے ہیں۔

علی شریعتی کے بارے میں امام خمینی (1902-1989ء) کے تاثرات کیا ہیں؟ اس سلسلے میں حامد الجار اپنے ایک دوست کے حوالہ سے جو علی شریعتی کا مداح ہے، کہتے ہیں کہ میرے اس دوست نے امام خمینی سے دریافت کیا کہ کیا آپ کی رائے میں مرحوم ڈاکٹر شریعتی کا کام بھی عظیم اثرات کا حامل نہیں تھا؟

"Do you not think that work of the late Dr. Shariati also was of great effect?"(16)

تو آیت اللہ خمینی نے جواب دیا:

"Dr Shariati's teachings aroused a certain discussion among the Ulama, but at the same time had a great effect upon leading back the younger intellectuals".(17)

ترجمہ: ''ڈاکٹر شریعتی کی تعلیمات علماء کے مابین مخصوص بحث ومباحثہ کا باعث بنیں، مگر اس کے ساتھ ہی ذہین وفطین نوجوانوں کو دین کی طرف واپس لانے میں بھی عظیم اثرات کی حامل تھیں''۔

"The followers of Dr. Shariati should go beyond what Dr. Shariati offered them, to investigae the traditional. In the same way the traditional Ulama should recognise that none of the Ulama said the last word on anything".(18)

ترجمہ: ''ڈاکٹر شریعتی کے پیروکاروں کو روایتی علوم کی تحقیق کے سلسلہ میں ڈاکٹر شریعتی کے پیش کردہ افکار سے آگے بڑھنا چاہئے۔ اسی طرح روایت پرست علماء کو بھی یہ بات تسلیم کرنا چاہئے کہ کسی بھی معاملہ میں کسی عالم کا قول حرف آخر نہیں''۔

اس طرح امام خمینی نے علی شریعتی کی خدمات کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ان کے پیروکاروں اور روایتی علماء کے مابین مزید افہام وتفہیم اور راہِ اعتدال اپنانے کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔

پاکستان کے نامور صحافی اور مصنف جناب محمد صلاح الدین (سابق مدیر روزنامہ

''جسارت'' و ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی) ڈاکٹر علی شریعتی کا مختصر مگر جامع الفاظ میں تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انقلاب ایران کو فکری غذا مہیا کرنے والوں میں ڈاکٹر شریعتی کا مقام بہت اُونچا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم ایرانی طلبہ کو اس انقلاب سے منسلک کرنے کی خدمت انہوں نے ہی انجام دی ہے۔ انہوں نے شاہ کے عہد میں قید و بند کی صعوبتیں اُٹھائیں اور اس راہ میں اپنی جان کی قربانی دی۔ مغرب سے تخاطب، اس کے افکار و نظریات کے ابطال اور مغربی ماحول میں رہنے والے نوجوانوں سے اسلام کی حقانیت کا لوہا منوانے میں ان کے پر زور طرزِ استدلال اور دل نشین اندازِ تحریر نے عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ایران کی نوجوان اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نسل کے لئے وہ ہیرو کا مقام رکھتے ہیں۔ قم کے علماء بھی ان کی خدمات کے معترف اور ان کی فکر کی سلامتی کے مداح ہیں۔ ان میں اگر کوئی کمی تھی تو صرف یہ کہ وہ فقیہ نہیں تھے، دینی مدرسہ کے سند یافتہ نہ تھے اور جبہ و دستار کی ظاہری علامات سے خالی تھے۔ لیکن انقلاب ایران میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ صف اول میں نمایاں حیثیت کے حامل نظر آئیں گے۔ اور شہادت کے معاملہ میں بھی وہ ''سابقون الاولون'' میں شامل ہیں۔ (19)

تصانیف شریعتی

ڈاکٹر علی شریعتی کے مختصر احوال کے بعد ان کی تصانیف و مقالات اور مطبوعہ تقاریر وخطبات کی جو فہرست میسر آسکی ہے، وہ من وعن درج ذیل ہے:

لیست آثار معلم شهید دکتر علی شریعتی

1- آیا مسلمانان پیش از کرستید کلب امریکا راکشف کردند؟	تهران
2- المجاهد الجزائر	پیرس، الجزائر
3- آری این چنین بود برادر	حسینیه ارشاد (21 رمضان 50)
4- سرمقاله های ایران آزاد (ارکان جبهه ملی)	پیرس
5- انتظار مذهب اعتراض	حسینیه ارشاد (50/8/18)
6- از کجا آغاز کنیم؟	دانشگاه آریا مهر (50/9/1)
7- ابعاد فکری	دانش سرای عالی سپاه دانش (1350)
8- امت و امامت در جامعه شناسی	حسینیه ارشاد (11 تا 14 فروردین 1351)
9- اجرای برنامه مسجد الجواد (تاریخ در اسلام)	تهران (49/12/14)
10- اسلام در امریکا	
11- استحمار	مدرسه عالی دختران
12- انقلاب در ارزش ها	دانشکده ادبیات، تهران

13- انسان و تاریخ	دانشگاه فنی، تهران
14- اگریستا نسیالزم	دانشگا ملی (زمستان 50)
15- استاندارد های ثابت در تعلیم و تربیت	دانش سرای عالی سپاهیان انقلاب
16- اگر مارکس و باب نبودند	تهران (55.54)
17- اخلاق	مشهد
18- امام رضا	تهران
19- انسانها ومنابع انسانها	
20- اقتصاد	تهران
21- انسان وجهان	
22- الأـمة فی الاسلام	
23- اشعار (قوی سپید، غریق راه، درکشور، شمع زندان)	
24- اقبال	حسینیه ارشاد
25- ماو اقبال	
26- بیست وسه سال فداکاری در راه مکتب	حسینیه ارشاد (50/7/16)
27- بازگشت به خویش	جند یشاه پور. اهواز
28- بازگشت به خویشتن	جندیشاه پور. اهواز
28- بازگشت به خویشتن	فرور دین 55
29- بازگشت به کدام خویشتن	

30- بیعت و وصایت	کانون مهندسین، تهران
31- بیان الادیان	
32- استخراج و تصفیه منابع فرهنگی (انسان و اسلام)	دانش کده نفت
33- ایمان در علم	دانش گاه مشهد، تالار رازی
34- انسان دیروز و انسان امروز	دانش کده علوم، مشهد
35- انسان بی خود	دانش کده ادبیات، تهران
36- اومانیسم در قصه خلقت آدم	دانش کده نفت
37- انسان در تمدن جدید	
38- اسلام شناسی	
39- انسان و اسلام	اباادان
40- ابوذر غفاری	مشهد
41- ادبیات چیست؟ شعر چیست؟	
42- انسان، اسلام و مکتب های مغرب زمین	دانشگاه مشهد (بین 44 تا 49)
43- انقلاب شیعی سربداريد	
44- الیناسیون	
45- ازهجرت تاوفات (محمدّ خاتم پیغمبران)	

46- بـدبینـی و خوشبینی، همراه نامه
مجله آستان قدس (1340) ای به
استاد محمد تقی شریعتی

47- پاسخ به سوالات (عمومی) وارشاد	(مربوط به دروس دانشگاه مشهد)
48- پیام (مجله)	نشـریـه دانشـجویان (دانشکده نفت، ابادان)
49- پیروان علی و رنجهای شان	حسینیه ارشاد (51/8/4)
50- پیروزی درشکست	حسینه ارشاد
51- پس از پیغمبر	حسینه ارشاد
52- پس از پیغمبر	دانشکده ادبیات درس
53- پس از شهادت	مسجد نارب (50/12/7)
54- پدر، مادر، مامتهیم	حسینیه ارشاد (50/8/21)
55- تولد دوباره اسلام	
56- تامل در خویش	
57- تاین بی وتاریخ	روزنامه (1336)
58- تشیع علوی و تشیع صفوی	حسینیه ارشاد (ابان 50)
59- تشیع سرخ	حسینیه ارشاد
60- تاریخ قرون جدید	دانش گاه مشهد
61- تاریخ کشورهای مجاور (روسیه، عراق، ترکیه، پاکستان)	دانشکده ادبیات

62- تاریخ ایران پس از اسلام	دانشکده ادبیات
63- تاریخ علم	دانشکده علوم
64- تاریخچه تکامل فلسفه	مشهد (1324)
65- تاریخ ادیان، تاریخ فلسفه	نشریه پلی تکنیک
66- توتم پرستی	تهران
67- توحید، فلسفه، اخلاق	حسینیه ارشاد
68- تاریخ ارزش آن در اسلام	حسینیه ارشاد (49/5/15)
69- تمدن و تجدد	دبیرستان مهمتی، مشهد (10 دیماه 1352)
70- جامعه شناسی شرک	دانشکده ادبیات، تهران
71- جهان بینی اسلام و انسان	نفت ابادان یا اهواز
72- جهان بینی توحید	
73- جامعه شناسی مکتب و آثار البرکامو به عنوان شاگرد لوکس	دانشکده ادبیات
74- جهان در آستانه بعثت	دروس دانشکده
75- چه باید کرد؟	حسینیه ارشاد
76- چه نیازی به علی	حسینیه ارشاد (50/8/17)
77- چهار زندان انسان	مدرسه عالی علوم تربوی
78- چگونه باید امروز زن روز بودا	
79- حسین وارث آدم	حسینه ارشاد (1349)
80- حج	حسینیه ارشاد (مهر 1350)

81- خدا در خانه یک کنیز	دانشگاه مشهد
82- خراسان	سازمان جنب سیاحان جهانگردی (1345)
83- خود سازی انقلابی	تهران (1355 خرداد)
84- خدا حافظ شهر شهادت	مشهد (1351)
85- درباره شهادت	تهران
86- دین و سرگزشتش	دانشکده ادبیات
87- دروس دانشگاه مشهد (تاریخ اسلام)	دانشگاه مشهد (45-50/46-47)
88- دروس تاریخ ادیان	دانشکده ادبیات (1/21 تا 50/11/15)
89- دائرة المعارف شیعه	
90- دروس اسلام شناسی	حسینیه ارشاد (1-50/11/15)
91- دروس تاریخ تمدن	دانش گاه مشهد
92- دروس فلسفه و معارف اسلام	دانش گاه مشهد
93- در نقد و ادب	مشهد (آبان 1346)
94- درباره صهیونیزم	فردوسی (52/9/26)
95- دیالکتیک پیدائش فرق در اسلام	مشهد
96- راجع به شعر	
97- روشنفکر و مسئولیت او در جامعه	تهران (49/5/31,30)

98- ریشه های اقتصادی، طبقاتی رنسانس	مدرسه عالی بازرگانی
99- رنسانس و تاریخ اروپا	دانشکده ادبیات، مشهد (1345.46)
100- ازپایان قرون وسطی تا 1660	مشهد
101- روح جدید علم	دانش گاه شریف
102- روزنامه "خراسان" (مقاله دیساسی)	روزنامه "خراسان" مشهد
103- رسالت روشنفکر برای ساختن جامعه	نفت
104- رنج بودن	مشهد
105- روش شناخت اسلام	حسینیه ارشاد (3 ابان 47)
106 زیبا ترین روح پر ستنده	حسینیه ارشاد (51/6/22)
107- زیر بنای توحید	تهران
108- زندانهای انسان	
109- سیمای محمدّ	حسینیه ارشاد
110- سوره روم (پیام امید به روشنفکران مسئول)	حسینیه ارشاد (51/8/5)
111- سیانیتسم و پیدائش طبقه روشن فکر	دانش گاه مشهد

112- سنگی از خلالی دوست	مجله فردوسی
113- سوغات	
114- سرسید احمد خان	تهران (5/53)
115- سال پنجم انقلاب الجزائر	پیرس
116- سلمان پاک	مشهد
117- سیمینار (ایام فاطمیه)	حسینیه ارشاد (22'23-4-51)
118- سوسیولوژی (Initiation)	پیرس
119- شیعه یک حزب تمام	حسینیه ارشاد
120- شهادت	حسینیه ارشاد (نهم محرم 1392)
121- علی مکتب وحدت، عدالت	حسینیه ارشاد (50/8/16)
122- 23 سال مبارزه، 25 سال سکوت، برای 5 سال حکومت	
123- علی حقیقتی به گوشه اساطیر	حسینیه ارشاد (15و 47/12/16)
124- علی تنها است	حسینیه ارشاد (48/9/11)
125- علی انسان تمام	حسینیه ارشاد (48/9/21)
126- علی بنیانگزار وحدت	حسینیه ارشاد (50/8/19)
127- علی یک روح در چند بعد	حسینیه ارشاد
128- علی اگر می گفت آری	حسینیه ارشاد
129- علت تشیع ایرانیان	دانش گاه مشهد
130- علل انحطاط مذاهب	دانش گاه ملی
131- علم یا اسکو لاستیک جدید	دانشکده پزشکی، دانشگاه تهران

132-	فرهنگ و ایدئولوژی	دانش سرای عالی، تهران (ابان 50)
133-	فلسفه تاریخ در اسلام	حسینیه ارشاد (49/6/1)
134-	فاطمه فاطمه است	حسینیه ارشاد (50/4/14)
135-	فلسفه نیایش	حسینیه ارشاد (49/1/12)
136-	فلسفه تاریخ	
137-	فضائل بلخ	پیرس (1962)
138-	قرآن و کامپیوتر	تهران
139-	قرن مادر جستجوی علی	حسینیه ارشاد (51/6/3)
140-	قاسطین، مارقین، ناکثین	حسینیه ارشاد (51/8/7)
141-	قرون جدید	دانش گاه مشهد
142-	کتاب	دانش گاه مشهد
143-	کتاب علی کتاب فردا کتاب همیشه	تهران
144-	کوپر	شرکت انتشار
145-	کانفرنس دکتر واقای Gord با مقدمه پدر ستیف setif	کلیسای ز زولیت های پیرس
146-	گفتگو علی با کیوز	زندان سیته، (1965)
147-	مسئولیت شیعه بودن	حسینیه ارشاد (50/8/15)
148-	متمدن و متجدد	حسینیه ارشاد (48/2/19)

149- میعاد با ابراهیم مشهــــــد، تــــــالار رازی(28-48/12/29)

150- مذهب علیه مذهب حسینیه ارشاد (22-49/5/23)

151- ماشین دراسارت ماشینیسم پلی تیکنک (5 شهرپور 1350)

152- مقدمه نمایش ابوذر حسینیه ارشاد (مهر 1351)

153- مقدمه سرحجر بن عدی مشهد

154- مرگ فرانتز فانون پیرس (1962)

155- مغضوبین زمین مـجـلـه دانشـجـویان ایرانی پیرس (1961ء)

156- مـرگ هـر لـحـظـه در کمین است تهران

157- مــقــدمـــه بـــر کتـــاب "سرودجهشها" شرکت انتشار

158- مبانی مسئولیت در انسان

159- یک ماه پا با پای پیغمبر حسینیه ارشاد (1350)

160- مجموعه سخن رانی مکه کاروان ارشاد (1348)

161- مجموعه سخن رانی مکه کاروان ارشاد (1349)

162- مخروط فرهنگ شناسی نفت ابادان

163- میز گرد بحث و انتقاد حسینیه ارشاد (50/9/23)

164- من فکرمی کنم پس من هستم مــجــلـــه "فـرهـنـگ" خـراسـان (1337)

-165 مکتب واسطه مکتب واسطه کـانون نشر حقائق اسلامی، مشهد (1334)

-166 منحنی زندگی حلاج پیرس، مشهد

-167 رسالـه تحقیقی برای وزارت علوم تهران

-168 نسل نو مسلمانان حسینیه ارشاد (47/8/3)

-169 نگاهی به تاریخ فردا حسینیه ارشاد (48/7/20)

-170 نقش انقلابی یاد و یاد آوران حسینیه ارشاد

-171 نیایش (انکسیس کارل) مشهد

-172 نماز تهران

-173 نـمونـه های عالی اخلاقی در اسلام است، نه دربحمدون

-174 مقالات نامه پارسی پیرس (1962/2)

-175 نامه ها پیرس (1961)

-176 به خرسند تهران

-177 سید ابراهیم سیلانی تهران

-178 ارشاد تهران

-179 قانون پیرس

-180 پدر تهران

-181 احسان تهران

-182 پوران پیرس و تهران

183- یادداشت فتوکپی
(6 صفحه تنظیم شده بوسیله دکتر)

184- یکبار دیگر ابوذر	حسینیه ارشاد (خرداد 1351)
185- یادداشتهای پراگنده چاپ نشده	
186- یک حلوش تابی نهایت صفر	حسینیه ارشاد
187- هدفها (درزمینه چه باید کرد)	ارشاد
188- هنر در انتظار موعود	دانش گاه مشهد(تالار رازی)
189- هجرت و تمدن	حسینیه ارشاد
190- اعلامیه های کنگره لوزان	لوزان (1962)
191- به کجا تکیه کنیم؟	پیرس (1960/2)
192- بیعت	کانون مهندسین، تهران
193- زندگی علی پس از مرگش	حسینیه ارشاد (48)
194- جزدو کوچک اصالت	
195- شعر	تهران، منزل آقای همایون (شورای 55)
196- مقدمه برنمایش نامه دشمن مردم	تهران (1355)
197- روشن فکران	حسینیه ارشاد
198- سؤال و جواب	تهران
199- نامه کاشف الغطاء	(خرداد 50)

200- مخروط جامعہ شناسی فرھنگی (پانینر 52)

201- انتظار عصر حاضر از زن مسلمان تھران (بھار 52)

202- نیاز ھای انسان امروز جندیشاہ پور

203- ایدئولوژی اھواز

204- پاسخ بہ سوالات و انتقادات (میز گرد) حسینیہ ارشاد

205- Disalienation des societes musulmanes (از خود بیگانگی زدائی جامعہ ھا ی مسلمان) پیرس (1961/2)

206- Sociology d'initiation پیرس (1962)

207- La'nge Solitaire پیرس (1960)......[20]

خلاصہ کلام

تصانیف ومقالات شریعتی کی اس طویل فہرست سے ڈاکٹر علی شریعتی کے طرز فکر و تخاطب اور تبحر علمی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔تاہم اس حوالہ سے یہ پیش نظر رکھنا لازم ہے کہ علی شریعتی کی بہت سی کتب وتصانیف ان لیکچرز اور خطابات پر مشتمل ہیں جو انہوں نے مختلف اوقات میں ''حسینیہ ارشاد'' تہران نیز دیگر علمی ودینی مجالس واجتماعات میں ارشاد فرمائے۔اور ان کی اشاعت وطبع نو کا کام مختلف مواقع کی بناء پر بالعموم متفرق ومتنوع انداز میں ہوا۔لہٰذا تمام تر احتیاط کے باوجود تصانیف شریعتی کی فہرست میں تکرار وترمیم واضافہ کا امکان رد نہیں کیا جاسکتا۔

نیز مختصر احوال شریعتی کے ہمراہ تصانیف ومقالات شریعتی کی اس طویل فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ڈکٹر علی شریعتی بحیثیت مفکر ایران ومحقق تشیع عظیم المرتبت اور نادر المثال ہیں۔ نیز ان کی مختلف انوع تصانیف نے زبان واسلوب اور کیفیت وکمیت ہر ہر لحاظ سے جدید فارسی ادبیات میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ وفی الجملہ:

دکتر علی شریعتی عالم و عارف، مفکر و مؤلف،
استاذ و باحث، ادیب و شاعر، خطیب و قائد،
مجدد فکر شیعی، مبارز فکری و اجتماعی،
شهید ملت ایران و رائد اتحاد عالم اسلام بود

۞ ۞ ۞

(حواشی)

(1) مذکورہ احوال شریعتی ماخوذہ و مترجمہ از لیکچر پروفیسر حامد الگر (الجار) بحوالہ علی شریعتی، مطبوعہ در کتاب:

Islami Revolution in Iran

(Editted by: Dr. Kaleem Siddiqui)

Muslim Institute, London, 1980.

(2) ڈاکٹر علی شریعتی: ما و اقبال، تہران، حسینیہ ارشاد، ص 16۔

(3) اقتباس از لیکچر حامد الگر، مطبوعہ در کتاب: Islamic Revolution in Iran

(Editted by: Dr. Kaleem Siddiqui)

Muslim Institute, London, 1980, P.46.

(4) ڈاکٹر علی شریعتی: فاطمہ فاطمہ است، تہران، سازمان انتشارات حسینیہ ارشاد، طبع دوم، تیر ماہ 1356، ص 98۔

(5) ڈاکٹر علی شریعتی: فاطمہ فاطمہ است، ص 176-177۔

(6) علی شریعتی: فاطمہ فاطمہ است، ص 177، حاشیہ 1۔

(7) علی شریعتی: فاطمہ فاطمہ است، ص 177، حاشیہ 2۔

(8) ڈاکٹر علی شریعتی: تشیع علوی و تشیع صفوی، دفتر تدوین و تنظیم مجموعہ آثار معلم شہید ڈاکٹر علی شریعتی، چاپ دوم، ص 85۔

(9) ڈاکٹر علی شریعتی: تشیع علوی و تشیع صفوی، ص 85-86۔

(10) ڈاکٹر علی شریعتی: تشیع علوی و تشیع صفوی، ص 50۔

(11) ڈاکٹر علی شریعتی: تشیع علوی و تشیع صفوی، ص 49۔

(12) مثلاً ملاحظہ ہو جمل و صفین و نہروان کے تاریخی حوالوں سے تحریر شدہ علی شریعتی کی تصنیف: قاسطین، مارقین، ناکثین، بعد۔

(13) علی شریعتی، قاسطین، مارقین، ناکثین، تہران، انتشارات قلم، چاپ دوم، لا تاریخ 1358، ص 36۔

(14) علی شریعتی، تشیع علوی و تشیع صفوی، ص 205۔

(15) علی شریعتی، تشیع علوی و تشیع صفوی، ص 258,259، 260۔

(16) Hamid Algar: Islamic Revolution in Iran, P.46.
(Editted by Dr. Kaleem Siddiqui)
Muslim Institute London, 1980.

(17) Hamid Algar: Islamic Revolution in Iran, P.46.

(18) Hamid Algar: Islamic Revolution in Iran, P.46.

(19) محمد صلاح الدین: انقلاب ایران ۔ کیا کھویا کیا پایا، مطبوعہ کراچی، ص 133۔

(20) تصانیف علی شریعتی کی یہ فہرست بنیادی طور پر بعض مطبوعہ کتب شریعتی کے آخر میں درج فہرست سے منقول ہے۔ مقالات و کتب کے آگے درج شدہ مقام اور تاریخیں، مقام و سن اشاعت یا مقام و تاریخ خطبات کو ظاہر کرتی ہیں اور فہرست کتب کے ہمراہ یونہی درج ہیں ۔ اس فہرست میں تکرار اور ترمیم و اضافہ کی گنجائش موجود ہے۔

✿ ✿ ✿

۵۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

یادیں، ملاقاتیں

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

یادیں، ملاقاتیں

راقم الحروف جنوری 1979ء میں بطور لیکچرر شعبہ عربی، کلیہ شرقیہ (اورینٹل کالج) جامعہ پنجاب، لاہور سے وابستہ ہوا تو 1870ء میں تاسیس شدہ یہ کالج ایک صدی بعد بھی اساطین علم و ادب کا نادر المثال مرکز تھا۔ شعبہ عربی میں مولانا نور الحسن خان، مولانا عبدالصمد صارم الازہری، ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، سید محمد کبیر احمد مظہر، شعبہ فارسی میں ڈاکٹر عبدالشکور احسن، ڈاکٹر سید محمد اکرم، ڈاکٹر محمد بشیر حسین، ڈاکٹر آفتاب اصغر، ڈاکٹر نسرین اختر اور شعبہ پنجابی میں ڈاکٹر شہباز ملک، ڈاکٹر اسلم رانا اور جناب حفیظ تائب جیسے نامور اساتذہ موجود تھے، جبکہ شعبہ اُردو کی عددی اکثریت اور خصوصی حیثیت نمایاں تر تھی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی (پرنسپل)، ڈاکٹر وحید قریشی (ڈین)، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر عبید اللہ خان، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر سہیل احمد خان شعبہ اُردو کے اساتذہ کرام تھے اور حفظ مراتب کے ساتھ ساتھ بھی اس شعبہ کے قومی، برصغیری اور عالمی تشخص کے عظیم الشان نمائندے تھے جو اپنے تبحر علمی و ادبی کے ساتھ سادگی و بے ساختگی، شرافت و وضعداری اور علم و ادب کی مجسم تصویر تھے۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

اس کہکشان علم و ادب اور نامورانِ تدریس و تحقیق میں ایک دراز قد، گندمی رنگ، زیادہ تر شلوار قمیض اور واسکٹ یا شیروانی میں ملبوس ایک بارعب مگر حلقہ یاراں میں ہنستی مسکراتی دلآویز

شخصیت ایسی تھی جسے میر مجلس اور شمع محفل کی حیثیت حاصل تھی ۔ یہ تھے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار جن کے دولت کدے (کمرے) پر ٹھیک گیارہ بجے روزانہ محفل چائے نوشی مع لوازمات (بسکٹ و دیگر ساز و سامان بیکری) برپا ہوتی تھی ، جس میں شرکت کی کالج کے تمام اساتذہ کو دعوت عام تھی اور اس کے تمام تر اخراجات و انتظامات (بشمول چائے دم کرنے اور میز سجانے) کی رضا کارانہ ذمہ داری محترم ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنے مضبوط کاندھوں پر اُٹھا رکھی تھی اور بلا امتیاز محمود و ایاز ڈاکٹر وحید قریشی کی عظیم شخصیت سے ہم جیسے نو واردان تدریس تک سبھی کو ''لنگر انداز'' ہونے ، نیز لنگر سے حسب ضرورت حصہ پانے کا اذن عام تھا ۔

یہی محفل انجم ڈاکٹر غلام حسین صاحب سے راقم الحروف کے تقرب کا باعث بنی اور اوّل روز سے ہی ان کی سخت گیری و مردم بیزاری کی تمام تر روایات وحکایات صادقہ وکاذبہ کے باوجود ان کی شخصیت وعظمت کے گہرے نقوش راقم کے دل و دماغ پر نقش کرتی چلی گئی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کی شفقت وعنایت اور راقم کی نیازمندی کا سلسلہ ان کی وفات تک کم وبیش اٹھائیس برس جاری رہی ، جبکہ ان کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ ان کی چاہت اور بے رُخی دونوں ہی انتہا پسندانہ تھیں اور وہ شاید ہی کسی سے مستقلاً خوش رہ پاتے ہوں ۔

عدم خلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

اس ابتدائی تاثر وتعارف کے بعد رفتہ رفتہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب کی عظیم الشان شخصیت کے مختلف دریچے وا ہوتے چلے گئے ، مثلاً ان کی اصول پسندی ، راست گوئی ، پابندی وقت ، شرافت ووضعداری ، احساس ذمہ داری ، احقاق حق وابطال باطل اور وفاداری بشرط استواری ۔ وہ ایک خوددار اور خودکار انسان تھے ۔ بٹالہ (گورداسپور) سے قیام پاکستان کے بعد لاہور میں مستقل قیام تک ان کی زندگی غربت وغریب الوطنی ، کڑی محنت ومشقت اور مصائب و صدمات کے کئی کٹھن مراحل سے گزری ۔ بالآخر وہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ رئیس کلیہ شرقیہ (اورینٹل

کالج) کے توسط سے 1959ء میں شعبہ اُردو جامعہ پنجاب میں لیکچرار مقرر ہوئے اور پھر 1984ء میں ساٹھ سال کی عمر میں بطور پروفیسر اپنی سبکدوشی تک انہوں نے تدریس وتحقیق، تصنیف وتالیف اورتحریک وتقریبات بسلسلہ اُردو زبان وعلوم مشرق عظیم الشان خدمات انجام دیں، جن میں تاریخ اورینٹل کالج (1870ء۔1962ء) اور بعد ازاں ''تاریخ جامعہ پنجاب'' (1882ء۔1982ء) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ''تاریخ جامعہ پنجاب'' کی تصنیف کا فریضہ خود رئیس الجامعہ ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا نے سینکڑوں اساتذہ جامعہ میں سے انتخاب کر کے آپ کے سپرد کیا اور واقفان احوال کو خبر ہے کہ انہوں نے یہ تصنیف خانس پور (ایوبیہ) کے خوبصورت ویرانے میں خود اختیاری نظر بندی وقید تنہائی کے ساتھ دن رات کی محنت شاقہ سے چند ماہ کی قلیل مدت میں مکمل فرمائی اور تمام تر حوالہ جات اور احوال وآثار کے ساتھ ان کا ایک نادر المثال کارنامہ ہے، انہی دو کتابوں کی اساس پر بعد ازاں ''تاریخ جامعہ پنجاب'' مؤلفہ ڈاکٹر زاہد منیر عامر اور ''تاریخ اورینٹل کالج'' مرتبہ ڈاکٹر نسرین اختر، نیز ''تاریخ اورینٹل کالج'' (بزبان انگریزی) مرتبہ ڈاکٹر سید سلطان محمود حال ہی میں منظر عام پر آئی ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ وقیع و مؤقر ہے، مگر نقش اول اور سنگ بنیاد کی حیثیت بہر حال تاریخی معلومات اور ادبی چاشنی کی حامل ڈاکٹر غلام حسین صاحب کی تالیف کردہ ہر دو تاریخوں کو ہی حاصل ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار سکول کے ریکارڈ کے مطابق 15 اگست 1942ء کو بٹالہ (ضلع گورداسپور، صوبہ پنجاب) میں ایک متوسط ومعزز ارائیں خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے پڑدادا میاں سلطان محمد اور ان کے بھائی میاں غلام محمد لاہور سے آ کر بٹالہ میں آباد ہوئے۔ ڈاکٹر غلام حسین کے دادا کا نام میاں بھاگ محمد اور والد کا نام میاں محمد دین تھا، جو بٹالہ شہر میں اپنی زمینوں اور باغات کی نگہداشت کرتے تھے۔ بعد ازاں جب بعض سرکاری عمارتوں (سول ہسپتال، مشنری چرچ، سٹی پولیس سٹیشن) کے لئے یکے بعد دیگرے کئی ایکڑ شہری زمین انگریزوں نے حکماً معمولی رقم کے عوض حاصل کر لی تو ایک متوسط زمیندار خاندان کی کفالت کے لئے ناکافی اس بقیہ زمین کو

ٹھیکے پر دے کر میاں محمد دین کاروبار کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے سوتیلے بھائیوں نے والد کی وفات کے بعد باقی ماندہ زمینوں اور اثاث البیت کو ہڑپ کرنا شروع کردیا تھا اور انہیں ابتدائی تعلیم کے بعد کاروبار کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس سلسلہ میں وہ زیادہ تر امرتسر میں رہے۔ وہیں ایک شریف گھرانے کے کسان کی صاحبزادی مہتاب سے ان کی شادی ہوئی، چنانچہ امرتسر ڈاکٹر غلام حسین کا ننھیالی شہر تھا۔ ''ذوالفقار'' کا تخلص یا لاحقہ ان کے سکول کے ایک استاد کا عطا کردہ تھا۔

ڈاکٹر غلام حسین صاحب نے ابتداً میں محلے کی مسجد میں قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی، مگر وہاں کے ماحول سے عدم مناسبت کی بنا پر چند ماہ بعد ہی یہ تعلیم ادھوری چھوڑ بیٹھے۔ پھر مشن سکول، (اے لیڈی آف انگلینڈ سکول) بٹالہ میں آٹھ سال تعلیم حاصل کی۔ مڈل کا امتحان یہاں سے پاس کر کے آخری دو سال مسلم ہائی سکول، بٹالہ میں گزارے اور وہیں سے 1941ء میں میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ بٹالہ تقریباً 75 فیصد مسلم اکثریت کا شہر اور ضلع گورداسپور بھی مسلم اکثریت کا ضلع تھا، جسے انگریز اور ہندو کی ملی بھگت سے ریڈکلف ایوارڈ کے ذریعے 17 اگست 1947ء کو بھارتی مشرقی پنجاب میں شامل کر کے تحصیل پٹھان کوٹ کے ذریعے بھارت کو ریاست جموں وکشمیر تک رسائی کا راستہ فراہم کیا گیا۔

ڈاکٹر غلام حسین کل آٹھ بہن بھائی تھے، ایک بھائی اور دو بہنیں ان سے بڑی تھیں اور دو بھائی اور بہنیں چھوٹی تھیں۔ جب آپ پانچویں جماعت میں تھے تو آپ کی والدہ کا چند ہفتے نمونیہ میں مبتلا رہ کر اچانک انتقال ہوگیا اور گھر کا انتظام بڑی شادی شدہ بہن (آپا جی) کے بعد والی بہن فاطمہ نے ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ پندرہ برس کی عمر میں سنبھالا، جو خود ڈاکٹر صاحب سے چار برس بڑی تھیں اور آخر تک ان کی خیر خواہ و ہمراز رہیں۔ آپا جی اور ان کا خاندان تقسیم کے وقت بٹالہ کے قریب اپنے گاؤں ہی میں شہید کر دیئے گئے اور فاطمہ بہن کا تقسیم سے پہلے بائیس تئیس برس کی عمر میں (1943ء میں) بٹالہ ہی میں انتقال ہوگیا۔ یہ والدہ کی وفات کے بعد آپ کے لئے دوسرا شدید صدمہ تھا، جس کے اثرات آپ پر آخر عمر تک رہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ساتویں جماعت کے نئے مضامین (عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت) میں، جن میں سے صرف ایک زبان اختیار کی جاسکتی تھی، عربی کا انتخاب کیا۔ انٹرمیڈیٹ کے لئے ایم اے او کالج، امرتسر میں داخلہ لیا جس کے پرنسپل اس وقت ڈاکٹر محمد دین تاثیر تھے۔ انٹرمیڈیٹ میں انگریزی لازمی کے علاوہ تاریخ، ریاضی، فارسی اور دینیات (آپشنل) کا انتخاب کیا۔ چند ماہ کالج میں تعلیم پانے کے بعد تعلیم کا سلسلہ مالی دشواریوں کی وجہ سے منقطع کرنا پڑا جس کے اسباب میں سے والد صاحب کی سخت گیری، بڑے بھائی کے والد کے سامنے ان پر آزادروی وفضول خرچی کے الزامات، نیز والد صاحب کے حنفی بریلوی حلقہ احباب کا دینی تعلیم کے حصول کے لئے انہیں بریلی مدرسہ بھجوانے کا مشورہ وغیرہ تھے۔ جب ان کے والد ان کی کالج کی تعلیم کے خلاف ہو گئے اور فیس وغیرہ کی ادائیگی کے لئے کوئی جز وقتی کام بھی نہ مل سکا تو آپ کالج چھوڑ کر واپس بٹالہ آ گئے۔ چند ماہ بعد نارتھ ویسٹرن ریلوے کی جانب سے کمرشل کلرکوں اور اسٹیشن ماسٹروں کی آسامیوں کے لئے درخواستیں طلب کرنے کے ایک اخباری اشتہار کو دیکھ کر آپ نے درخواست ارسال کر دی۔ بعد میں لاہور میں منعقدہ مقابلے کے امتحان اور پھر انٹرویو میں کامیابی کے بعد طبی معائنہ ہوا۔ ستمبر سے نومبر 1942ء ڈھائی ماہ والٹن سکول، لاہور میں کمرشل کلرک (کوچنگ گروپ) برائے بکنگ، پارسل کی تربیت پائی اور پھر اس زمانے کی ضرورت کے مطابق سینٹ جان ایمبولینس کا فرسٹ ایڈ کورس بھی کیا۔

دسمبر 1942ء میں فارغ التحصیل ہو کر راووال میں تقرر ہوا۔ پھر چند ماہ بعد عارضی تقرر گجرات اسٹیشن پر نو دس ماہ کے لئے ہوا، بعد ازاں دو ماہ لاہور چھاؤنی میں تقرر رہا۔ پھر دھاریوال اسٹیشن (بٹالہ سے بارہ میل آگے اور گورداسپور سے آٹھ میل پیچھے) تبادلہ ہوا۔ دو ماہ گزرنے کے بعد واپس لاہور آئے اور پارسل آفس میں ٹرانزٹ پر کام کیا۔ دو ماہ بعد تین سال کے لئے مستقل طور پر سیالکوٹ تبادلہ ہوا مگر دو ماہ بعد ہی ڈویژنل آفس والوں نے مستقل طور پر (تین سال کے لئے) امرتسر بھیج دیا۔ پس 1943ء کے موسم بہار میں آپ واپس اپنے ننھیالی شہر

امرتسر پہنچ گئے۔ اب آپ کے سامنے کالج میں تجدید داخلہ اورتحریک پاکستان کے لئے مسلم لیگ کے ساتھ کام کرنے کے دوراستے تھے، آپ نے موٴخر الذکر کا انتخاب کر کے اپنے شب و روز ملازمتی کام کے علاوہ تحریک پاکستان کے لئے وقف کر دیئے۔

3 جون 1947ء کے اعلان آزادی کے روز آپ امرتسر میں تھے۔ اس اعلان کے مطابق پنجاب کی تقسیم کے ساتھ مشرقی اور مغربی پنجاب کے اضلاع، مسلم اور غیر مسلم آبادی کے لحاظ سے دونوں صوبوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔ امرتسر مشرقی پنجاب میں اور گورداسپور مغربی پنجاب (پاکستان) میں شامل کیا گیا اور ساتھ ہی قطعی تقسیم کے لئے حد بندی کمیشن کے تقرر کا فیصلہ سنایا گیا۔ گورداسپور کا ضلع جس کی صرف ایک تحصیل پٹھان کوٹ میں غیر مسلموں (ہندو، سکھ، عیسائی بطور مجموعی) کی معمولی اکثریت تھی۔ اعلان میں مشکوک سنا بنادیا گیا تھا۔ امرتسر کی اجنالہ تحصیل میں مسلمانوں کی آبادی ستر فیصد سے اُوپر تھی۔ یہی صورت فیروزپور اور زیرہ تحصیلوں کی تھی اور یہ علاقے مغربی پنجاب کے اضلاع سے متصل رہے، مگر انہیں پاکستان میں شامل نہ کیا گیا۔

امرتسر میں ڈاکٹر غلام حسین صاحب کا قیام اپنے والد اور بھائی کے ہمراہ شریف پورہ کے مکان میں رہتا۔ یہیں سے اگست 1947ء میں آگ اور خون کے دریا سے گزرتے ہوئے مشرقی پنجاب کے ستر ہزار مربع میل سے زائد علاقے میں لاکھوں مسلم شہداء، ہزاروں اغوا شدہ مسلمان بیٹیوں اور لاکھوں لٹے پٹے مہاجرین اسلام کے صدمے برداشت کرتے ہوئے، بالآخر لاہور پہنچ کر مقیم ہوئے، جبکہ بقیہ افراد خانہ بھی بٹالہ سے لاہور آ گئے۔ بڑی بہن اور ان کا خاندان بٹالہ کے قریب اپنے قصبے میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔

1950ء میں ادیب فاضل کے امتحان کے لئے کلیہ شرقیہ (اورینٹل کالج) لاہور میں داخلہ لیا۔ اپریل، مئی 1951ء میں امتحان دیا۔ ستمبر 1951ء میں ایف اے کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ 1953ء میں بی اے کیا اور پھر دوبارہ اورینٹل کالج کے طالب علم بنے۔ پرنسپل وصدر شعبہ اُردو، ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایم اے اُردو کے کل وقتی طالب علم کی حیثیت سے داخلہ کی

اجازت دے دی۔ 1953ء کے اس سیشن میں ایم اے سال اول کے طلبہ کی کل تعداد دو لڑکیوں (عابدہ، ناصرہ) سمیت آٹھ تھی۔ ایم اے مقالہ مولانا ظفر علی خان پر لکھا اور 1955ء میں ایم اے اُردو کرلیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر سید عبداللہ کے مشورے سے ایم اے عربی میں داخلہ لیا۔ چند ماہ کے بعد 1957ء کے وسط میں پی ایچ ڈی کے لئے آپ کا تحقیقی موضوع منظور ہوگیا اور بطور ریسرچ اسکالر یونیورسٹی میں انتخاب اور تقرر بھی ہوگیا۔ 1959ء کے آخر میں پی ایچ ڈی کا کام مکمل ہوا اور اُردو ٹائپ وغیرہ کے مراحل سے گزر کر یونیورسٹی میں ڈگری کے لئے پیش کیا گیا۔

1960ء میں آپ کو پی ایچ ڈی اُردو کی ڈگری عطا ہوگئی۔ مقالہ کا عنوان تھا، ''اُردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر''۔ ممتحنین میں پروفیسر ڈاکٹر عندلیب شادانی (ڈھاکہ یونیورسٹی) پروفیسر ڈاکٹر محی الدین قادری (جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن) اور پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان (جامعہ سندھ، جامشورو) شامل تھے۔

1959ء ہی میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا تقرر شعبہ اُردو جامعہ پنجاب (اورینٹل کالج) میں بطور لیکچرر ہوگیا۔ اکتوبر 1959ء سے درس و تدریس کا باقاعدہ آغاز کیا۔ 1970ء میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہوئے۔ 1978ء سے صدر شعبہ اُردو کے فرائض بھی انجام دینا شروع کئے۔ اس دوران جامعہ پنجاب کی صد سالہ تاریخ لکھی۔ جامعہ کی اس خدمت کے اعتراف میں ساٹھ سال کی عمر میں اگست 1984ء میں پچیس سالہ ملازمت کے بعد سبکدوش ہونے پر مدت ملازمت میں چانسلر کے ایما پر تیشن سال کی توسیع کردی گئی، مگر ایک سال بعد ہی 1985ء میں اُردو اور مطالعہ پاکستان کے استاد کے طور پر استنبول یونیورسٹی چلے گئے، جہاں عربی و فارسی کے موجودہ شعبوں کے علاوہ ایک نئے شعبہ اُردو کی بنیاد رکھنا ان کے مقدر میں تھا۔ پانچ سال جامعہ استنبول میں اُردو کی تدریس و تحقیق میں صرف کئے۔ (25 اکتوبر 1985ء۔ 1990ء)۔ وہیں سے اگست 1986ء میں حج بیت اللہ اور زیارت روضہ رسول ﷺ کی سعادت حاصل کی۔ بعد ازاں ''بزم اقبال''، لاہور کے ڈائریکٹر اور مجلّہ ''اقبال'' کے مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام

دیں۔اسی ''بزم اقبال'' کے دفتر میں آخری دن گزار کر گھر پہنچے اور نماز عصر کے بعد حرکت قلب بند ہونے سے دار الفنا سے دار البقا کی جانب کوچ کر گئے۔

موت کو سمجھے ہے غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی شادی مئی 1957ء میں اپنی ہی برادری کے بابو غلام محمد اور حبیب النساء کی بیٹی عنقا خاتون سے ہوئی جن کی بڑی بہن خورشید النساء سے بٹالہ ہی میں بچپن سے تعلق خاطر تھا،مگر بعض بدخواہوں کی باتوں میں آکر بابو غلام محمد (بٹالہ سے ہجرت کے بعد مقیم فیصل آباد) کی وفات کے بعد ان کی بیوہ حبیب النساء نے ڈاکٹر غلام حسین کا پیام ٹھکرادیا اور خورشید النساء کی شادی بٹالہ ہی کے اکمل شاہ کے فرزند مقیم اوکاڑہ سے کردی۔ خورشید النساء اس مجبوری کی شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد بیمار ہوکر انتقال کر گئیں۔ بعد ازاں انہی کی چھوٹی بہن عنقا خاتون سے ڈاکٹر غلام حسین کی شادی ہوئی۔آپ کی اولاد میں پانچ بیٹیاں اور دو بیٹے شامل ہیں۔[1]

تصنیف وتالیف

ڈاکٹر غلام حسین کی تصانیف ومقالات کی تعداد کثیر ہے۔ خاص خاص تصانیف کی فہرست درج ذیل ہے۔

1- تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج،لاہور (1962ء)
2- مقالاتِ آزاد (نواب سید محمد) مع مقدمہ (1965ء)
3- مضامین سرسید،انتخاب مع مقدمہ (1966ء)
4- ظفر علی خان،ادیب وشاعر (1967ء)
5- محاسن خطوط غالب (طبع اول) (1969ء)
6- محاسن خطوط غالب باضافہ (طبع ثانی) (2003ء)

7-	دیوان زادہ (شاہ حاتم، تدوین مع مقدمہ)	(1975ء)
8-	اکبر و اقبال	(1977ء)
9-	اقبال کا ذ■نی ارتقا	(1978ء)
10-	صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب	(1982ء)
11-	قومی زبان کی تلاش	(1985ء)
12-	قومی زبان کی بازیافت	(1986ء)
13-	اقبال ایک مطالعہ	(1987ء)
14-	اقبال ایک مطالعہ (طبع ثانی)	(1997ء)
15-	خاطرات ظفر حسن ایبک (تدوین)	(1990ء)
16-	پنجاب، تحقیق کی روشنی میں	(1991ء)
17-	ظفر علی خان، حیات، خدمات و آثار	(1993ء)
18-	گاندھی، لسان العصر کی نظر میں	(1994ء)
19-	جلیانوالہ باغ کا قتل عام	(1996ء)
20-	جدوجہد آزادی میں پنجاب کا کردار	(1996ء)
21-	میاں سر فضل حسین، تاریخ کے آئینے میں	(1997ء)
22-	تحریک ہجرت، پس منظر و پیش منظر	(1977ء)
23-	حیات قائداعظم: ایک نظر میں	(1997ء)
24-	پاکستان، تصور سے حقیقت تک	(1997ء)
25-	اقبال کا ذہنی و فکری ارتقاء	(1998ء)
26-	تاریخ بزم اقبال	(2000ء)
27-	استنبول: سفر و حضر میں	(2001ء)

-28	کشمیر ایک جلتا ہوا انگارہ	(2002ء)
-29	افغانستان اور اقبال	(2003ء)
-30	مطالعۂ اکبر الہ آبادی	(2003ء)
-31	مسدس حالی (صدی ایڈیشن) تدوین نو مع اضافہ	(2003ء)
-32	مردم دیدہ وشنیدہ	(جنوری 2007ء)
-33	بزم اکبر سے بزم اقبال تک	(2004ء)
-34	جگر لخت لخت	(اپریل 2005ء)
-35	اُردو شاعری کا سیاسی وسماجی پس منظر	(1966ء)

36- The Muslim Community: A Sociological Study (Iqbal) Ed: 1994,(مع اردو ترجمہ: ظفر علی خان) Published by: Bazmi Iqbal.

37- Pakistan, As Visualized by Iqbal & Jinnah (1997), published by Bazm-i-Iqbal, Lahore.

38- Development of Iqbal's Mind and Thought (1988)published by Bazm-i-Iqbal, Lahore.[2]

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اردو کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، پنجابی اور انگریزی زبانوں سے بھی واقف تھے اور بعد ازاں اپنے قیام ترکیہ کے دوران اُنہوں نے ترکی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ 1984ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد اُن کا ایک عظیم الشان کارنامہ جامعہ استنبول (ترکیہ) میں مکمل شعبہ اُردو کا قیام ہے۔ آپ بطور استاد اُردو ومطالعہ پاکستان 25 اکتوبر 1985ء کو وہاں پہنچے اور کئی سال تک قیام فرمایا۔ جامعہ استنبول کے ادارہ شرقیات میں عربی اور فارسی کے شعبے تو موجود تھے، مگر اُردو کی تدریس کا شعبہ نہ تھا۔ اس سلسلہ میں آپ نے جو انتھک جدوجہد کی، وہ کئی حوصلہ شکن مراحل پر مشتمل تھی، مگر آپ نے خندہ پیشانی سے دیارِ غیر میں تمام مصائب برداشت کرتے ہوئے بعض نامور ترک اور پاکستانی احباب وارباب بالخصوص مجاہد

کبیر جناب ظفر حسن ایبک (3) اور ڈاکٹر نہاد چیتن (4) صدر ادارہ شرقیات و پروفیسر عربی، ادبیات فیکلٹی، استنبول یونیورسٹی کے تعاون سے شعبہ اُردو کو مستقل شعبہ کی حیثیت دلوائی اور اس کے لئے اساتذہ بھی تیار کیے، جن میں موجودہ رئیس شعبہ اُردو پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق ار اور گلزار خانم سرفہرست ہیں۔

ڈاکٹر خلیل طوق ار سے آپ نے اپنی صاحبزادی ثمینہ کا عقد کر کے اُردو زبان اور پاک ترک برادری کو مزید تقویت فراہم کی۔ اب ڈاکٹر خلیل بھی اُردو میں صاحب کتاب ہیں اور بیک وقت اُردو، فارسی اور ترکی زبانوں کے ماہر، منفرد ادیب ومؤلف و محقق شمار ہوتے ہیں۔ چند برس پہلے ڈاکٹر غلام حسین مرحوم کے ہمراہ کلیہ شرقیہ (اورینٹل کالج) تشریف لانے پر ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ صاحب (صدر شعبہ اقبالیات) کے آستانے (ان کا دفتر مرکز اہل علم وادب وروحانیت ہے) پر ان سے تعارف ہوا اور انہوں نے استنبول جا کر راقم الحروف کی ابتدائی ترکی شناسی کی تقویت کے لئے کتاب اور اشرطہ (کیسٹس) بھی بھجوائے نیز اپنی خوبصورت اُردو میں ایک خط بھی لکھا۔ اگرچہ راقم کے لئے ترکی دانی ''ہنوز دلی دور است'' والا معاملہ ہے، مگر آنجناب کی خوبصورت شخصیت اور ارسال کتاب وکاست نے واقعی شاگرد وفرزند غلام حسین ہونے کا عمدہ ثبوت فراہم کر دیا۔ ورنہ اچھی خاصی رقم خرچ کر کے پہلی ملاقات میں کئے گئے سرسری وعدے کو پورا کرنے کا رواج ہمارے ہاں ہنوز مفقود نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے یوم ولادت (15 اگست 1924ء) کی مناسبت سے اپنے اردو سفرنامہ ''پیارا ملک ہے پاکستان'' میں ان کی شخصیت کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔

> ''والد صاحب کے لئے پاکستان کی تاریخ کے عینی گواہ کہہ کر میں تو مبالغہ نہیں کرتا۔ انہوں نے واقعتاً تحریک پاکستان کے سارے مراحل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ 1924ء کو بٹالہ میں پیدا ہوئے ہیں اور بٹالہ کے تعلیمی اداروں اے۔ ایل۔ او۔ ای ہائی سکول اور مسلم ہائی

سکول میں تعلیم حاصل کی۔ 1941ء کو میٹرکولیشن کر کے ایم۔اے۔او
کالج، امرتسر جسے وہ زندہ دلوں کا شہر کہہ کر یاد کیا کرتے ہیں، میں پڑھتے
رہے۔اسی دوران تحریک پاکستان شروع ہوئی۔وہ بھی اس تحریک میں
دل وجان سے شریک ہوئے اور مسلم لیگ کے کارکنوں میں شامل ہو کر
دیہات اور قصبات میں مسلم لیگ کے پروپیگنڈا کے لئے گئے۔
بٹوارے کے زمانے کے سارے درددکھ سہہ لئے اور چودہ اگست یعنی
پاکستان کے قیام کے وقت وہ امرتسر، لاہور اور بٹالہ کے درمیان آتے
جاتے رہے اور امرتسر اور گردونواح میں مسلمانوں کا قتل عام خود دیکھا اور
پٹھان کوٹ میں اپنی بڑی بہن اور خاندان کے دیگر افراد کے قتل ہونے
کی افسوس ناک خبر سنی اور آخر کار لاہور آ کر بسے اور اس دن سے آج تک
پاکستان کی تاریخ کی گواہی دیتے رہے ہیں۔(5)

سالِ رواں (2007ء) جنوری، فروری میں ڈاکٹر خلیل طوق ار مع اہلیہ وصاحبزادی لاہور آئے تو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ان کے ہمراہ کئی مرتبہ کلیہ شرقیہ تشریف لائے اور ان کے ساتھ بعض طویل نشستوں کا موقع ملا۔ یہ ان کی شفقت وعنایت تھی کہ اس کے علاوہ بھی وہ جب کبھی ''بزم اقبال'' یا اپنے گھر سے کالج تشریف لاتے تو مجھے شرف ملاقات بخشتے۔وفات سے چند ماہ پہلے قلبی مرض کی شدت میں ہسپتال بھی داخل رہے، بعد میں ٹیلی فون پر مزاج پرسی کی تو ان کی زیارت کے لئے حاضر ہونے کا ارادہ ظاہر کیا، مگر نہ جاسکا۔کئی روز بعد جب آپ کالج تشریف لائے تو فرمانے لگے، آپ نے تو مجھ سے ملنے آنا تھا۔میں شرمندہ بھی ہوا اور حیرت زدہ بھی کہ انہوں نے اس بات کو یادرکھا اور انتظار کرتے رہے۔اسی دوران میں جناب احمد ندیم قاسمی کے جنازے میں (10 جولائی 2006ء، لاہور) انہیں موجود پا کر میں نے عرض کیا کہ آپ کی بڑی ہمت ہے کہ اتنی شدید بیماری کے بعد نقاہت کے عالم میں آپ نماز جنازہ کے لئے تشریف لائے ہیں تو فرمانے لگے ''قاسمی صاحب سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں اور ابھی چند روز پہلے وہ میری

عیادت کے لئے میرے دفتر (بزم اقبال) میں آئے تھے''۔

نماز جنازہ میں قدرے تاخیر تھی، لہٰذا نقاہت کی وجہ سے انہیں کرسی منگوا کر بیٹھنا پڑا اور پھر ٹیلی ویژن والوں نیز احباب نے اس کرسی کے گرد گھیرا تنگ کر دیا اور سلام وکلام اور تعزیت و تاثرات بر وفات قاسمی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

وفات سے چند روز پیشتر اورینٹل کالج میں تشریف لائے۔ ان کی سب سے چھوٹی صاحبزادی (تنویر) جو ایم اے اُردو کی طالبہ ہیں، انہیں گھر سے گاڑی میں لائیں، (والدہ کی وفات کے بعد وہی والد کی تمام ضروریات کا خیال رکھتی تھیں، مصطفیٰ ٹاؤن، ممدوٹ بلاک، لاہور میں ڈاکٹر صاحب کا خوبصورت گھر لازم وملزوم باپ بیٹی کا مسکن تھا)۔ متبسم چہرے کے ساتھ السلام علیکم کہہ کر میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کچھ دیر تشریف فرما رہے۔ مجھے کچھ دیر کے لئے کمرے سے باہر جانا پڑا تو اُن سے اجازت لی، چند منٹ بعد واپس آیا تو وہ جا چکے تھے، مجھے فوراً خیال آیا کہ ناراض ہو کر چلے گئے اور اس خیال کے ساتھ ہی میری حالت دگرگوں ہونے لگی کہ ساری عمر کے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔ فوراً سامنے والے کمرے میں داخل ہوا کہ شاید ڈاکٹر سید اکرم شاہ صاحب کے پاس ہوں تو واقعی وہاں تشریف فرما تھے، میں نے معذرت کی تو مسکراتے چہرے کے ساتھ فرمایا: کوئی بات نہیں میں اکیلا بیٹھا تھا، اس لئے دوبارہ شاہ صاحب کے پاس آ گیا۔ پھر اُن کی واپسی تک میں ان کے ہمراہ رہا۔ انہوں نے اپنی ترتیب دادہ کتاب ''ظفر حسن ایبک'' بھجوائی تھی، میں نے اُس کی تعریف کی کہ نہایت دلچسپ ہے، مجھے فوری طور پر پوری پڑھنا پڑی۔ پھر اُن کی کتاب ''مردم دیدہ وشنیدہ'' کا بھی ذکر آیا، جو نو عظیم علمی و ادبی شخصیات کا تذکرہ ہے۔ اس پر انہوں نے اپنی خوبصورت تحریر میں میرے نام چند سطریں لکھی تھیں، میں نے اس کتاب کی افادیت اور ادبی اسلوب کی بھی تعریف کی۔ ڈاکٹر خلیل طوق ار کی کتاب ''پیارا ملک ہے پاکستان'' بھی انہوں نے بھجوائی تھی جو ایک ترک کا خوبصورت اُردو سفرنامہ ہے۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے فرمانے لگے: آپ کو میری آپ بیتی (جگر لخت لخت)

نہیں ملی؟ تو میں نے عرض کیا، جی نہیں۔ کہنے لگے اچھا بھجواؤں گا۔ میں نے ان سب کرم فرمائیوں پر شکریہ ادا کیا اور وہ اپنی صاحبزادی تنویر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔(یہ کتاب ان کی وفات کے بعد ان کی صاحبزادی تنویر نے جو والد کے علم و ادب کی وارث ہیں، راقم الحروف کو پیش کی)۔

اس بات کو چند روز ہی گزرے تھے کہ 13 جون 2007ء کی رات 10 بجے شعبہ عربی کے استاد ڈاکٹر حارث مبین میرے گھر تشریف لائے۔ ان کی بے وقت آمد اور سنجیدہ انداز نے مجھے خوفزدہ کر دیا، میں نے اندر آنے کو کہا تو کہنے لگے: آپ کا فون نہیں مل رہا تھا، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب آج سہ پہر حرکت قلب بند ہو جانے سے گھر پر ہی انتقال کر گئے۔(إنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون) میں صرف یہی بتانے آیا ہوں، کیونکہ ڈاکٹر سید محمد فرید (استاد شعبہ فارسی وفرزند ڈاکٹر سید محمد اکرم) نے میرے ذمے لگایا تھا کہ اُنہیں ضرور اطلاع دینا، اُن کا بڑا تعلق تھا۔ بعد ازاں اُن کی صاحبزادی تنویر نے بتایا کہ ابو صبح دفتر گئے، واپس آ کر کھانا کھایا، عصر کی نماز پڑھی اور صوفے پر بیٹھ گئے اور اسی حالت میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ مجھے یقین نہ تھا، انکل اکرم شاہ کو بلایا جن کا گھر ساتھ ہی ہے اور قریبی ڈاکٹر کے پاس لے گئے جس نے موت کی تصدیق کر دی، مگر میں پھر بھی ایک اور ہسپتال کی طرف دوڑی کہ شاید ڈاکٹر کی رائے غلط ہو، لیکن انہوں نے بھی موت کی تصدیق کر دی کہ حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہو گیا ہے۔

اگلے روز وقت مقررہ صبح سات بجے سے کچھ پہلے ان کی رہائش گاہ (ممدوٹ بلاک، مصطفیٰ ٹاؤن، لاہور) پر نماز جنازہ کے لئے حاضر ہوا تو وہاں سوگواروں کا جم غفیر تھا۔ ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ، ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک، ڈاکٹر محمود علی ملک، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، افضل حق قرشی، ڈاکٹر محمد سلیم مظہر، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، ڈاکٹر ضیاء الحسن، ناصر عباس نیر اور دیگر بہت سے احباب و نیازمند موجود تھے۔ چونکہ ان کی وصیت تھی کہ نماز جنازہ ڈاکٹر عبدالغنی صاحب پڑھائیں جنہوں نے شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے آپ کی زیر نگرانی پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا تھا اور

ظاہری بصارت کی کمزوری کے باوجود ذوقِ علم وتحقیق کے ساتھ ساتھ نور بصیرت وروحانیت سے مالا مال تھے، انہیں اسلام آباد سے پہنچنے میں قدرے تاخیر ہوگئی، لہٰذا نماز جنازہ اُن کے گھر کے سامنے پارک میں تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ادا کی گئی۔ چہرے کا آخری دیدار کیا تو باریش اور روشن چہرے پر مومنانہ طمانیت تھی۔ یوں لگتا تھا کہ محو استراحت ہیں ابھی اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اگر گزشتہ رات ہی ساڑھے آٹھ بجے کا وقت مقرر ہوجاتا تو اخبارات کے ذریعے اُن کے بقیہ وسیع حلقہ احباب وتلامذہ کو بھی نماز جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوجاتی، جس کا اظہار جناب سہیل عمر (ڈائریکٹر، اقبال اکیڈمی، لاہور) اور دیگر حضرات نے کیا۔ بہر حال قدرت کو یہی منظور تھا، بعد ازاں احباب وتلامذہ کی کثیر تعداد اگلے روز قرآن خوانی میں شریک ہوگئی۔

نماز جنازہ کے بعد پنجاب یونیورسٹی (نیو کیمپس) کے قبرستان میں اپنی اہلیہ کے قریب آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ قبرستان میں قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف بٹ، پروفیسر ڈاکٹر نیاز احمد (کیمیکل انجینئرنگ) اور بعض دیگر احباب بھی پہنچ گئے۔ جب تدفین اور دعا کے بعد ہم سب واپس جارہے تھے تو ڈاکٹر خورشید رضوی ہانپتے کانپتے پہنچے اور کہنے لگے: مجھے قبرستان تلاش کرنے میں بہت وقت لگ گیا، میں ذرا قبر کی زیارت اور دعا کرآؤں۔ یہ ایسے شخص کی قبر کی زیارت تھی جو سعدی کے اس شعر کا مصداق تھے۔

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو

در سینہ ہای مردم عارف مزار ماست

خلاصہ کلام یہ کہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار مرحوم کی شخصیت وخدمات کیفیت وکمیت ہر دولحاظ سے عظیم الشان ہیں، جن کا احاطہ کسی ایک مضمون تو کیا، پی ایچ ڈی کے ضخیم مقالہ میں بھی محال ہے۔ چمن میں ایسا دیدہ ور بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ بقول اقبال:

کشاکش زم وگرما، تپ وتراش وخراش

زخاک تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی

وہ دراز قد، متناسب جسم اور گندمی رنگت کے ساتھ مردانہ وجاہت کا عمدہ نمونہ تھے۔ خوب صورت وخوب سیرت، پابند صوم وصلوٰۃ، اسلام، پاکستان اور اُردو زبان سے عشق ومحبت کی مجسم تصویر، انگریزی کے ساتھ ساتھ عربی، پنجابی، فارسی اور ترکی سے واقف اور مشرقی زبانوں کے فروغ کے لئے متحرک، عظیم اُستاد ومحقق، کثیر التصانیف اور نامور ادیب ومؤرخ جو آخر دم تک سرگرم عمل رہے۔ اُن کی وفات کے بعد علم وادب اور تصنیف و تحقیق کی دُنیا میں اُن کا نام اور کام سنہرے حروف میں ابدی طور پر مذکور رہے گا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہ بانی کرے

حواشی

(1) خلاصہ احوال بحوالہ متفرق مقامات از آپ بیتی ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار'' جگر لخت لخت''۔ مطبوعہ مکتبہ خیابان ادب، لاہور، اپریل 2005ء۔

(2) فہرست تصانیف بحوالہ '' جگر لخت لخت'' مؤلفہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، 2005ء، صفحہ 307-308۔

(3) ظفر حسن ایبک کے احوال وخدمات کے لئے ملاحظہ ہو'' مردم دیدہ وشنیدہ'' مؤلفہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، الفیصل پبلشرز، لاہور، جنوری 2007ء، صفحہ 145-160 نیز '' خاطرات''، ظفر حسن ایبک (تدوین: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار)، مطبوعہ لاہور، 1990ء۔

(4) ڈاکٹر نہاد چیتن کے احوال وخدمات کے لئے ملاحظہ ہو'' مردم دیدہ وشنیدہ'' مؤلفہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، الفیصل پبلشرز، لاہور جنوری 2007ء صفحہ 161-166۔

(5) سفرنامہ خلیل طوق ار بعنوان '' پیارا ملک ہے پاکستان'' مطبوعہ با اہتمام سید معراج جامی، بزم تخلیق ادب، پاکستان، کراچی، 2007ء، صفحہ 49۔

۶۔ عصر جدید
میں
ترکی زبان

عصر جدید میں ترکی زبان

ترکی زبان مقدونیہ سے سائبیریا تک ایشیا اور یورپ کے لاکھوں مربع کلومیٹر پر محیط رقبے پر رائج شدہ زبان ہے جو بنیادی طور پر چار بڑے لہجوں یا بولیوں پر مشتمل ہے۔

1- مشرقی الطائی لہجات (Eastern Altay Dialects)

2- کرغیز وتاتار کے مغربی لہجات
(Western Dialets of Kirgyz and Tatar)

3- وسط ایشیائی لہجات(Central Asian Dialects)

4- جنوبی لہجات، ترکمان، آذربائی جان، اناضولو، کیریم کی بولیاں نیز عثمانی ترکی (عثمان لی ترکچہ سی)
(Southern Dialects of Turkamen, Azerbaijan, Anadolu, Kerem & Ottomon Turkish).[1]

یہ ترکی زبان عصر جدید میں پندرہ کروڑ سے زیادہ لوگوں کی زبان ہے اور ترکی زبان کے ان مختلف لہجوں اور بولیوں میں بہت کم فرق ہے، بالخصوص جنوبی بولیوں میں یہ فرق بہت معمولی ہے اور تمام ترکی بولنے والے افراد و اقوام کو ایک دوسرے کی بات چیت سمجھنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی۔

عصر جدید میں ترکی بولنے والے ممالک میں ترکیہ سرفہرست ہے جس کی آبادی سات کروڑ سے متجاوز ہے اور یہ دُنیا بھر میں ترکی زبان کا مرکز ومحور ہے۔ علاوہ ازیں قبرص، آذربائی جان، ازبکستان، قازقستان، ترکمانستان، کرغیزستان، چینی ترکستان (سنکیانگ) سے روس میں تاتارستان اور دیگر علاقوں تک ترکی زبان غالب و رائج ہے جس کے قومی لہجے ترکی، آذری، ازبک، قازق، ترکمان، کرغیز، کاشغیری (اوغور Ughur) تاتار وغیرہ مختلف قومی ناموں سے

سرکاری قومی حیثیت کے حامل ہیں۔

جہاں تک رسم الخط کا تعلق ہے تو اسلام کی اشاعت کے بعد ترکی زبان بیسویں صدی کے ربع اول تک یعنی خلافت عثمانیہ کے اختتام تک عربی رسم الخط میں لکھی جاتی رہی ہے، جسے عثمانی رسم الخط کا نام دیا گیا اور اسی عثمانی ترکی زبان وخط میں ہزار سال سے زائد عرصہ کا ترکی زبان و ادب کا عظیم الشان ذخیرہ ہے۔ 1924ء میں خلافتِ عثمانیہ کے اختتام کے بعد ترکی زبان کے لئے جدید جمہوریہ ترکیہ میں لاطینی رسم الخط اختیار کرلیا گیا اور 1917ء کے اشتراکی انقلاب روس کے بعد روسی ترکستان (مغربی ترکستان) میں سرکاری طور پر عربی رسم الخط کی جگہ ترکی یا ترکستانی زبان کے لئے روسی رسم الخط (Crillyic) اختیار کرلیا گیا جو بہت سے تغیرات کے ساتھ لاطینی رسم الخط ہی سے ماخوذ ہے۔

سوویت یونین میں 1926ء میں مرکزی کمیونسٹ پارٹی نے تمام ترک علاقوں میں عربی رسم الخط کوختم کر کے لاطینی رسم الخط رائج کرنے کی قرارداد منظور کی اور بعد ازاں 1928ء میں ترکیہ کے عربی کی بجائے لاطینی رسم الخط اختیار کر لینے کے بعد روسی علاقوں میں لاطینی خط کو روسی رسم الخط سے بدل دیا گیا۔

چنانچہ سوویت یونین کی ترکی وان جمہوریتوں ازبکستان، قازقستان، کرغیز یا، ترکمانیا، آذربائیجان، نیز روسی فیڈریشن کے اندرترکی وان وحدتوں (تاتارستان وغیرہ) میں ترکی زبان روسی رسم الخط میں لکھی جانے لگی اور آج تک یہ خط رائج ہے۔ نیز ان ترکی لہجوں کے نام بھی متعلقہ جمہوریتوں کے حوالے سے ازبک، قازق، ترکمان، کرغیز، آذری وغیرہ مستعمل ہو گئے اور ساتھ ہی روسی زبان مشترکہ زبان کی حیثیت سے سرکاری وتعلیمی سطح پر غالب آگئی اوران ترک لہجوں پر گہرے اثرات کی حامل ہوگئی، نیز عربی رسم الخط میں زبانیں تحریر کرنا انقلاب روس کے بعد ممنوع قرار پایا اور یہ ممانعت 1991ء میں ان جمہوریتوں کی سوویت یونین سے علیحدگی اور اعلان آزادی سے کچھ پہلے سابق صدر میخائل گورباچوف کی زیر قیادت ''گلاس نوسٹ'' اور

''پیرسٹرائیکا'' کے زیرعنوان مذہبی اور ثقافتی آزادیوں کے فروغ کی سوویت پالیسی کے تحت عملاً ختم کردی گئی، تاہم سرکاری سطح پر روسی رسم الخط ہی ترکی الاصل زبانوں کے لئے رائج رہا۔عربی رسم الخط میں ترکستانی زبانیں لکھنے کی ممانعت کے طویل دور میں بھی عربی رسم الخط محدود سطح پر باقی رہا،مثلاً سوویت یونین کے ''ادارہ برائے یورپ وسائبیریا'' نے "الإسلام والعقيدة" کے نام سے عربی حروف میں ''اوفا'' شہر سے ایک کتاب 1957ء میں شائع کی۔[2]

مشرقی ترکستان میں جو کہ ''سنکیانگ'' کے نام سے ''عوامی جمہوریہ چین'' کا خودمختار علاقہ ہے، 1949ء میں جناب ماؤزے تنگ کی زیرقیادت اشتراکی ثقافتی انقلاب کے بعد ترکی زبان (کاشغری/اوغور) کے لئے چینی رسم الخط اختیار کرلیا گیا، نیز چینی زبان بطور مشترکہ سرکاری زبان کے غالب قرار پائی، تاہم عربی رسم الخط میں بھی ترکی زبان کسی حد تک لکھی جاتی رہی اور 1979ء میں زیادہ مذہبی وثقافتی آزادی ملنے کے بعد عربی رسم الخط دوبارہ وسیع پیمانے پر رائج ہوگیا۔

> Significantly the pinyin alphabet which was intended to make the Arabic script obsolete, is being abondoned for most purposes.[3]

ایرانی آذربائیجان میں آذری (ترکی) زبان صدیوں سے عربی رسم الخط ہی میں لکھی جاتی ہے جبکہ سوویت یونین سے علیحدہ ہوکر 1991ء میں اعلانِ آزادی کرنے والی جمہوریہ آذربائیجان میں آزادی کے بعد روسی کی بجائے لاطینی رسم الخط اختیار کرلیا گیا ہے۔حال ہی میں روسی جمہوریہ تاتارستان اور بشکیرستان میں تاتاری زبان کے لئے عربی رسم الخط کی تعلیم کو ابتدائی جماعتوں سے شامل نصاب کرلیا گیا ہے۔[4]

اس حوالے سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جمہوریہ تاجکستان میں سوویت یونین سے علیحدگی واعلانِ آزادی (1991ء) کے بعد تاجیک زبان کے لئے جو ایرانی فارسی اور افغان

دری زبان سے مشابہ ہے، روسی رسم الخط کی بجائے سابقہ عربی رسم الخط اختیار کرنے کا فیصلہ کئی سال پہلے کیا جا چکا ہے۔

ان تمام تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ ترکی زبان ایشیا اور یورپ کے وسیع و عریض علاقوں تک پھیلی ہوئی ایک عظیم زبان ہے جو ترکیہ، ترک جمہوریہ شمالی قبرص، آذربائیجان، ازبکستان، قازقستان، ترکمانستان، کرغیزستان، سنکیانگ (چین) تا تارستان (روس) وغیرہ میں مختلف قومی ناموں سے رائج و غالب ہے اور اس زبان کے اثرات البانیا، بوسنیا، کوسوو، مقدونیہ، بوسنیا سے مشرقی یورپ کے ممالک تک وسیع ہیں۔ نیز بلغاریہ سے جرمنی تک اور دُنیا کے دیگر ممالک میں پھیلے ہوئے ایشیا و یورپ سے آسٹریلیا و امریکہ تک لاکھوں ترک باشندے ترکی زبان کی وسعت و عظمت کا نا قابل تردید ثبوت ہیں۔ ماضی میں ترکی زبان عربی کے ہمراہ صدیوں تک استنبول کی خلافت عثمانیہ کی زبان کی حیثیت سے پورے عالم عرب و اسلام میں اہم مقام کی حامل رہی ہے، حتیٰ کہ برصغیر پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت (1525ء۔ 1857ء) کے بانی ظہیر الدین بابر اور بعد کے مغل شہنشاہوں کی اصل زبان ترکی ہی تھی۔

موجودہ دور میں ''اقتصادی تعاون کی تنظیم'' (Economic Cooperation Organization) میں شامل دس ممالک میں سے پاکستان میں اُردو، ایران میں فارسی، افغانستان اور تاجکستان میں بالترتیب (فارسی سے مشابہ) دری اور تاجیک اور بقیہ چھ ممالک (ترکیہ، آذربائیجان، ازبکستان، قازقستان، ترکمانستان، کرغیزستان) میں ترکی زبان کے مختلف قومی لہجے رائج ہیں۔ اس طرح اس تنظیم کے رکن دس ممالک کی اکثریت (چھ ممالک) کی زبان ترکی ہے۔

پس ترکی زبان عصر جدید میں بھی ایک عظیم الشان علاقائی و بین الاقوامی مقام کی حامل ہے، جس کی وسط ایشیا اور عالم عرب و اسلام میں وسیع تر نشر و اشاعت کے لئے کوششیں جاری ہیں۔ جامعہ پنجاب میں بھی کلیہ شرقیہ (Oriental College) میں ترکی زبان کی سرٹیفکیٹ / ڈپلومہ سطح کی تدریس حکومت ترکیہ کے تعاون سے عرصہ دراز سے جاری اور روز افزوں ہے اور

جہاں تک ایک سے زیادہ رسم الخط کے مسئلہ کا تعلق ہے تو یہ مسئلہ بہت سی زبانوں کو درپیش ہے، مثلاً ملائیشیا میں ملائی زبان کے لئے سرکاری طور پر لاطینی رسم الخط رائج ہے، لیکن عربی رسم الخط میں بھی اخبار اور رسالے شائع ہوتے ہیں اور بعض ریاستوں میں عربی رسم الخط کو سرکاری حیثیت بھی حاصل ہے، پنجابی زبان، پاکستانی پنجاب میں عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور بھارتی پنجاب میں سنسکرت سے ماخوذ گورمکھی رسم الخط میں سرکاری و تعلیمی حیثیت کی حامل ہے۔اُردو اور ہندی زبانوں میں ایک بنیادی فرق عربی اور دیوناگری رسم الخط کا ہے، جبکہ فلموں، ڈراموں اور عام بول چال کی زبان جسے ہندی کا نام دیا گیا ہے، بنیادی طور پر اُردو ہی کی طرح ہے۔

پس جدید ترکی زبان اور اس کے رسم الخط کو سیکھنے کے بعد قدیم عربی یعنی عثمانی رسم الخط سے واقفیت بھی ترکی زبان کے طالب علم کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہے، تاکہ نہ صرف صدیوں پر محیط قدیم ترکی زبان و ادب تک رسائی ہو، بلکہ عربی الخط جدید ایرانی آذری اور کاشغری ترکی (اوغور) نیز افغانستان سے عراق تک پھیلی ہوئی دیگر مختلف ترکی بولیوں اور لہجوں (ازبک، ترکمان وغیرہ) سے بہتر واقفیت ہو۔اس حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ خود ترکی زبان کی یونیورسٹی سطح کی تعلیم میں عثمانی ترکی (عثمان لی ترکچہ سی) کا مضمون شامل نصاب ہے،جس سے قدیم ترکی کے ساتھ ساتھ عربی، اُردو اور فارسی جیسی زبانیں سیکھنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔

یہ چند صفحات اُردو دان افراد و اقوام میں ترکی زبان کے مختصر تعارف نیز ماضی وحال میں عربی ولاطینی (نیز روسی وچینی) رسم الخط میں لکھی جانے والی اس عظیم زبان کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے تحریر کی گئی ہیں۔اُمید کی جاتی ہے کہ ترکی دان اقوام وممالک کے روز افزوں باہم رابطہ وتعاون سے ترکی زبان کے مختلف لہجوں اور بولیوں کو ازسرنو مربوط کرنے اور ایک یا دو رسم الخط کے مسائل بتدریج حل ہوتے جائیں گے اور ماضی وحال کی طرح ترکی زبان کا مستقبل بھی عظیم الشان رہے گا اور اس سلسلے میں ''جمہوریہ ترکیہ'' کا کردار آئندہ بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہوگا۔

حواشی

(1) Yousuf Mardin: Colloquial Turkish (Revised Edition), London, Hanley and Boston, Routledge and Kegan Paul, 1976. P.1

(2) دکتورة س. اکیتر: الإسلام في الاتحاد السوفیتي، مقال في مجلة "التوحید" الطهران، محرم. صفر 1404ھ، ص 31.

(3) روزنامہ "نوائے وقت"، لاہور مورخہ 14 دسمبر 1984ء (انگریزی مقالہ منقول از "عربیہ" لندن)
The battle for hearts and minds in the heart of Asia,
Published in "Arabia", London.

(4) روزنامہ "کومرسانت" (Commersant) ماسکو (روسی زبان) 2004ء، بحوالہ آصف کیانی، اُستاد روسی زبان، جامعہ پنجاب، لاہور۔

مصادر و مراجع

(عربی)

1- اللّٰه جلّ جلاله: القرآن الكريم.

2- الآلوسي، شهاب الدين محمود: تفسير روح المعاني، مصر، إدارة الطباعة المنيرية، 1353ھ.

3- ابن اياس: بدائع الزهور في وقائع الدهور (تاريخ مصر)، القاهرة، المطبعة الأميرية الكبرىٰ (بولاق) الطبعة الأولى، 1311 ھ.

4- ابن كثير: تفسير القرآن العظيم، مصر، مطبعة المنار، 1347ھ.

5- ابن عبدربه: العقد الفريد. مصر، المطبعة الجمالية، 1331ھ.

6- البخاري: الجامع الصحيح، مصر، مطبعة بولاق، 1315ھ.

7- البغوي: معالم التنزيل، مصر، المنار، 1347ھ.

8- البيضاوي: أنوار التنزيل و أسرار التاويل، مصر، مصطفى البابي الحلبي، 1388ھ.

9- الجاحظ: البيان والتبيين، مصر، المكتبة التجارية الكبرىٰ، 1345ھ.

10- حاجي خليفة: كشف الظنون عن آسامي الكتب والفنون، بيروت، منشورات مكتبة المثنى، 1941م.

11- الخطيب التبريزي: مشكوٰة المصابيح، بمبئي، قاضي ابراهيم بن قاضي نور محمد، 1295ھ.

12- الزمخشري: الكشاف، مصر، المكتبة التجارية الكبرى، 1365ھ.

13- الزيّات احمد حسن: تاريخ الأدب العربي، القاهرة مكتبة الانجلو المصرية 1955م.

14- زيدان، جرجي: تاريخ آداب اللغة العربية، بيروت، دار مكتبة الحياة، 1967م.

15- السخاوي، شمس الدين، الإعلان بالتوبيخ لمن ذم التاريخ، دمشق، مكتبة القدسي، مطبعة الترقي، 1349ھ.

16- السخاوي، شمس الدين: الضوء اللامع لأهل القرن التاسع، القاهرة، مكتبة القدسي، 1353-1355ھ.

17- السيوطي والمحلي: تفسير الجلالين، دمشق، مكتبة المُلاّح، 1383ھ.

18- السيوطي، جلال الدين: المزهر، مصر، المكتبة الأزهرية، 1325ھ.

19- السیوطی، جلال الدین: نظم العقیان فی أعیان الأعیان (حرّره الدکتور فیلیب ک. حتی) نیویورک، المطبعة السوریة الأمیریکیة لصاحبها سلوم مکرزل، 1927م.

20- د. ظهور احمد اظهر: اقبال العرب علی دراسات اقبال، (جمع و اختیار و تقدیم)، المکتبة العلمیة، لاهور، نوفمبر 1977م / ذوالحجة 1397ھ.

21- الشوکانی: البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع، (القاهرة، مطبعة السعادة، الطبعة الأولی، 1348ھ.

22- العیدروسی، عبدالقادر: النور السافر عن أخبار القرن العاشر (ضبط و تصحیح: محمد رشید آفندی الصفّار) بغداد، المکتبة العربیة، مطبعة الفرات، 1353ھ/1934م.

23- الغزی، نجم الدین: الکواکب السائرة فی أعیان المائة العاشرة (ضبط و تحقیق: جبرئیل سلیمان جبور) بیروت، محمد أمین دمج و شرکاه، 1945م.

24- مسلم: الجامع الصحیح، مصر، المطبعة الکستلیة، 1283ھ.

25- النووی: المنهاج فی شرح مسلم بن الحجاج، مصر، المطبعة الکستلیة، 1283ھ.

26- مجلة التوحید، الطهران، محرم، صفر 1404ھ.

(فارسی)

27- اکرم، دکتر سید محمد: اقبال و جهان فارسی، لاهور، شعبه اقبالیات، دانشگاه پنجاب، 1999م.

28- خامنه ای، سید علی: اقبال، ستاره بلند شرق، پاکستان، اقبال اکادمی، 1994م.

29- شریعتی، دکتر علی: تشیع علوی و تشیع صفوی، دفتر تدوین و تنظیم مجموعه آثار معلم شهید دکتر علی شریعتی، چاپ دوم.

30- شریعتی، دکتر علی: فاطمه فاطمه است، تهران، سازمان انتشارات حسینیه ارشاد، طبع دوم، تیرماه 1356.

31- شریعتی، دکتر علی: قاسطین، مارقین، ناکثین، تهران، انتشارات قلم، چاپ دوم، آبانماه 1358.

32- شریعتی، دکتر علی: ما و اقبال، حسینیه ارشاد (مجموعه آثار شماره 5)، تیراژ، انتشارات الهام، دفتر تدوین و انتشار مجموعه آثار برادر شهید علی شریعتی در اروپا.

(اُردو)

33- اکرم، ڈاکٹر سید محمد: اقبال اور ملی تشخص، لاہور، بزم اقبال باشتراک شعبہ اقبالیات، جامعہ پنجاب، بسلسلہ گولڈن جوبلی، اکتوبر 1998ء۔

34- اقبال، ڈاکٹر جاوید: زندہ رود (حیات اقبال)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 2007ء۔

35- جامعہ پنجاب: اُردو دائرہ معارف اِسلامیہ، لاہور، نیولائٹ پریس و پنجاب یونیورسٹی پریس، 1393ھ/ 1974ء (ج10)۔

36- ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین: جگر لخت لخت، لاہور، مکتبہ خیابان ادب، اپریل 2005ء۔

37- ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین: مردم دیدہ و شنیدہ، لاہور، الفیصل پبلشرز، جنوری 2007ء۔

38- السخاوی، شمس الدین: الاعلان بالتوبیخ (اُردو ترجمہ از سید محمد یوسف) لاہور مرکزی اردو بورڈ، 1978ء۔

39- صلاح الدین، محمد: انقلاب ایران ۔ کیا کھویا، کیا پایا، طبع کراچی ۔

40- طوق ار، ڈاکٹر خلیل: پیارا ملک ہے پاکستان، کراچی، بزم تخلیق ادب (باہتمام سید معراج جامی) 2007ء۔

41- ظفر حسن ایبک: خاطرات (تدوین: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار)، لاہور، 1990ء۔

42- مطہری، سید مرتضیٰ: (نھضت ھای اِسلامی در صد سالہ اخیر) بیسویں صدی کی اِسلامی تحریکیں (اُردو ترجمہ از ڈاکٹر ناصر حسین نقوی)، راولپنڈی، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، نومبر 1980ء۔

43- ندوی: سید ابوالحسن علی: (روائع اقبال) نقوش اقبال (اُردو ترجمہ از شمس تبریز خان)، کراچی، مجلس نشریات اِسلام (برائے سروسز بک کلب) 1988ء۔

44- ہفت روزہ ''آتش فشاں'' لاہور۔

45- رسالہ جوہر، دہلی۔

46- روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور۔

English (انگریزی)

47- Algar, Hamid: Islamic Revolution in Iran (Editted by: Dr. Kaleem Siddiqui) London, Muslim Institute, 1980.

48- Gibb, H.A.R: Arabic Literature, Oxford University press, 1963.

49- Hamidullah, Dr. Muhammad: Introduction to Islam, Kuwait, International Islamic Federation of Students Organization (I. I. F.S.O.), 1977.

50- Hitti, Philip. K.:History of the Arabs, London, Macmillan, 1956.

51- Mardin Yousuf: Colloqual Turkish (Revised Edition), London, Hanley and Boston, Routledge and Kegan Paul, 1976.

52- Arabia (Monthly Magazine) London.

53- Daily. Komar Sant (Russian Language) Moscow.

✿✿✿